ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۳ | اپریل ۱۹۹۰ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۔/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

وفیات

تم کدھر چل دیے آج سورج ڈھلے

محترم جیلانی بی اے مرحوم کی یاد میں

نعیم صدیقی

وہ میرے پاس بیٹھے، ایک آدھ قہقہہ، دو تین جملے، ساتھ ہی "بس بس بس" پھر کچھ ایسے الفاظ کہ "قصہ ختم" ۔ (پراسرار سی بات، معلوم نہیں کون سا قصہ ختم) خیر میں نے باتوں کا رخ موڑنے کے لیے کہا کہ آپ دو چار دن میں کسی جگہ مجھے اور ایک آدھ اور صاحبِ دل کو بلوائیں اور چائے کی دعوت کریں اور بس کچھ قہقہے لگائیں ۔ وعدہ کیا! "انشاء اللہ انشاء اللہ" ۔ پیغام کا انتظار کرتا رہا ۔

مگر دو ہی چار دن میں جیلانی صاحب چٹ پٹ ہو گئے۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند ۔

اور جیلانی صاحب کی تدفین تو یوں محسوس ہوئی کہ پھولوں کے ایک انبار پر اُن کے محب مٹی ڈال آئے ۔ ہمارا قیمتی دیرینہ رفیق مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۹۰ء کو ہم سے جُدا ہوا جبکہ جمعہ کی پہلی اذان ہو رہی تھی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ !

چودھری غلام جیلانی مرحوم کو احباب اس وقت سے جانتے ہیں جب اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے پیریڈ میں مولٰنا مودودیؒ جدید طرز کے لکچر دے رہے تھے اور ملک غلام علی صاحب، شیخ فقیر حسین صاحب، مشتاق چاندنہ صاحب سے معلوم ہوا کہ جیلانی صاحب سنجیدگی شکن شوخ طبع نوجوان تھے ۔ بس وہیں سے یہ طائرِ پُر فشاں اسیرِ دام ہوا اور چند ہی پھڑپھڑاہٹوں میں عقاب بن گیا۔

میرا تعلق ماہنامہ چراغ راہ کے ذریعے استوار ہوا۔ بہ حیثیت مدیرِ چراغ راہ میری قوت بڑھ گئی

جب جیلانی بی۔ اے کے افسانے چراغِ راہ میں شائع ہونے لگے ۔ فنی لحاظ سے اور مقصدی نقطۂ نظر سے ان مؤثر افسانوں نے خدا پرستانہ اقدارِ تہذیب کو منعکس کرنے میں ہمیں نئی راہوں اور منزلوں سے آشنا کر دیا ۔ جیلانی صاحب انگریزی اور فرانسیسی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ چنانچہ "احوبہ" (جو کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوا) "بعلم بن بعور" اور "ڈبلیو فلپس کا کیس" جیسی چیزیں پیش کر کے انہوں نے مستقل کے ایک قد آور ادیب کو ہمارے تصوّر میں لاکھڑا کیا ۔ مگر جیلانی صاحب کو کچھ دوسرے فرائض کھینچ لے گئے اور اُن کے اندر ایک ادیب سسکیاں بھرتا رہ گیا، شاید اسی کے ردِ عمل میں وہ قہقہے بہت لگایا کرتے تھے۔

پھر ان کا ایک جلوہ وہ تھا جو جیل میں دیکھا ۔ مولٰنا مودودیؒ ہی کے لئے نہیں، وہ ہر ساتھی کے لئے بھی خادم بن گئے ۔ خصوصاً جب ۶۴ء میں تمام جماعتی اسیران کو سرکاری بورڈ کے سامنے پیش ہونے کے لئے اکٹھا کیا گیا تو وہ باورچی خانے کے ایسے انچارج تھے کہ قیدی مشقتیوں سے بڑھ کر وہ خود مشقتی تھے ۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ ملک نصراللہ خاں عزیزؔ مرحوم کے بعد ہفت روزہ ایشیا کو بطور جماعتی آرگن کے جاری رکھنا ہے ۔ چوہدری غلام مصطفیٰ آپ کے والدِ گرامی تھے ۔ چودھری صاحب ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو متولد ہوئے، بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی ۔ ۱۹۴۲ء میں جماعت میں داخل ہوئے۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کو مرکزی مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں صوبۂ پنجاب کی جماعتِ اسلامی کے امیر منتخب و مامور ہوئے اور ۱۹۷۹ء تک رہے ۔

آخرت کے لئے وہ دعوتِ اسلام، محبتِ رفقاء اور خدمتِ انسانیت اور خاندانی حُسنِ روابط کا جو توشہ سمیٹ لے گئے ، میرے خیال کے مطابق اس میں دوسروں کی دل آزاری یا حق ماری کی کوئی آلائش نہیں ہے ۔ خدا اُن کی تمام عبادات اور نیکیوں کو قبول کر کے اُن پر اجرِ جزیل دے اور جو کمزوریاں ، کوتاہیاں ، غلطیاں یا آلائشیں رہ گئی ہوں، اُن سے درگذر فرمائے۔ اُن کے اہلِ خانہ اور افرادِ خاندان پر بھی رحمتیں نازل کرے۔ نیز ہمیں اُن کا بدل اُن سے بھی بہتر عطا فرمائے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

رمضان کا مہینہ جاتے ہوئے دیکھتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے شہیدوں کے لہو کی شفق زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔ زمین پر دیکھیں تو ایک طرف کشمیر، افغانستان اور فلسطین تک اور دوسری طرف برما ارٹریا، یونان اور فلپائن تک سُرخ قالین سے بچھے ہوئے ہیں۔ اُوپر آسمان پر نظر ڈالیں تو گویا لال شامیانے تنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں یاقوت کے مہین ذرّوں کی طرح کا غبار پھیلا ہوا ہے۔

اِس غبار میں ذرا دُور دیکھیے تو عید الفطر ہمارے پیارے بھائیوں کے لاشوں کے بیچ سے راستہ بناتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی آرہی ہے۔ وہ ہر گام پر اَللہُ اَکبَر کہتی ہوئی پیش قدمی کرتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہلالِ عید کا جھنڈا خون سے تربتر ہے۔ عیدِ مہ رُو کی آنکھوں میں آنسو بھی ہیں، کیونکہ منظر سخت دردناک ہے، مگر اس کے چہرے پر خندہ بکھرا ہوا ہے جو نہ صرف اُن بندگانِ حق کے لیے تحفہ ہے جنہوں نے ماہِ صبر، ماہِ قرآن اور ماہِ جہاد کا حق ادا کیا اور اس کی برکتوں سے اپنا حصّہ پاکر دنیا و آخرت کی فلاح کا سامان کیا، بلکہ یہ ایک خندۂ استہزا بھی ہے، ظلم، جارحیت اور تعصب کی ان چھچھوری حرکتوں کے خلاف جن کے چیلنج نے مظلوموں میں پہلے سر اُٹھانے کا جذبہ پیدا کیا، پھر قدم اُٹھانے کا، پھر علم اُٹھانے کا اور آخر میں کلاشنکوف اُٹھانے کا —— یہاں تک کہ مجاہدینِ حق نے قیامت ہی اُٹھا دی اور یہ قیامت ظالم مظلوم کا حساب چکا دے گی۔

تو اے قارئین کرام! آپ نے رمضان کی برکتوں سے جتنا حصّہ پایا وہ آپ کو مبارک ہو، جتنا زیادہ قرآن کو پڑھا، سُنا، سمجھا اور اس کو سرمایۂ عمل بنایا وہ آپ کو

مبارک ہو۔ اپنا فطرانہ مستحقین تک پہنچایا وہ بھی آپ کو مبارک ہو۔

براہِ راست خود کسی جگہ جہاد میں شرکت کی یا مظلوم مسلم مجاہدین کی مدد کی، مالی اور اخلاقی طور پر کی، یا بعض علاقوں کی بے بس اور شدید اذیتوں سے دوچار مسلم اقلیتوں کو تقویت پہنچائی۔ ایسی خدماتِ عالیہ پر آپ کو صد بار مبارک! اور اب عید مناتے ہوئے جب آپ اپنے مطمئن ضمیر کے ساتھ خدا کے حضور دوگانہ عید میں تکبیرات کہتے ہوئے شکرانہ ادا کریں گے تو آپ ایک طرف خدائے بزرگ و برتر کے قریب ہوں گے اور دوسری طرف دنیا بھر کے مسلم مجاہدین کی صفوں کے ساتھ کھڑے تکبیروں کی آواز بلند کر رہے ہوں گے ـــــ آپ کو عید مبارک!

ہمیں وہ زمانہ ملا کہ اسے دَورِ جہاد کہا جانا چاہیے۔

آج جس دَور میں سے ہم گذر رہے ہیں اس میں ہر مسلم معاشرہ خداوندانِ الحاد کے جارحانہ حملوں اور میفروشانِ فحاشی کے سازشی نفوذ کی زد میں ہے۔ آج اسلام کو خود اپنی سرزمینوں میں غالب کرنے کے لیے، بہ حیثیت مسلمان اپنی آزادی یا وجود کو بچانے کے لیے، اسلام کو تحریف و تجدید کے حملوں سے بچا کر صحیح شکل میں قائم رکھنے کے لیے، کم سے کم اپنے اوپر بھی اسلام کے اُصول و احکام کو جاری کرنے اور اپنے گھروں کو غیر اسلامی فاسد معاشرت سے بچانے، نیز اپنی اولادوں کو ملحدانہ، فاسقانہ اور زر پرستانہ ماحول میں بہ حیثیت مسلمان کے پروان چڑھانے کے لیے سوائے جہاد کے اور کوئی راستہ نہیں رہا۔ جہاد زبان و قلم سے شروع ہو کر سیاست و معیشت اور تعلیم و تحریر کے مراحل سے گذرتا ہوا بالآخر اپنی آخری جھلک رزم گاہِ تاریخ میں دکھاتا ہے۔ ایک طرح کا جہاد افغانستان، فلسطین اور کشمیر میں ہو رہا ہے، ایک طرح کا جہاد فلپائن، اریٹریا میں جاری ہے۔ ایک طرح کا جہاد مسلم اقلیتوں کی مظلومی اور اس کے ساتھ بے مثال صبر و ثبات کی شکل میں برما، تھائی لینڈ، یونان اور بھارت میں ہو رہا ہے۔ ایک دوسری طرح کا جہاد جدید صلیبی معرکہ ہائے نفوذ کی شکل میں مسلم اکثریت رکھنے والے

ممالک مثلاً انڈونیشیا، سوڈان، مصر، نائیجیریا، الجزائر وغیرہ میں جاری ہے۔ جہاں مغرب کی استعماری قوتیں قرضوں اور اقتصادی حربوں اور سازشی ماہرین اور سفیروں کے ساتھ حیوانی کلچر اور عیسائی مشنریز کے اداروں کو لے کر مسلم اکثریت کو خراب کرتی ہیں اور اسلامی رجحانات کو تباہ کرتی ہیں۔ مسلمان جماعتیں ان کا مقابلہ کرتی ہیں، مگر صلیبی محاذ افتراق پیدا کر کے دوسری جماعتوں کو ان سے ٹکرا دیتا ہے۔ ایک اور جہاد آذربائیجان ازبکستان اور تاجکستان میں جاری ہے۔ اور ایک وہ جہاد ہے جو پاکستان کے عوام کشمیر اور افغانستان اور تمام زیر آزمائش مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جذباتی گھٹن کا دباؤ برداشت کرتے ہوئے بے حال ہو رہے ہیں جس کے نکاس کا کوئی راستہ ارباب اقتدار ان کو نہیں بنا کے دے رہے۔ وہ پچھلے دس برس سے افغانستان میں اور اب کشمیر میں آزادی اور اسلام کی خاطر اپنے برادران ملت کے خون کی ندیاں طاغوتی جبریت کے ہاتھوں بہتی دیکھ رہے ہیں، مگر اپنے آپ کو بے بسی کے قفس میں بند پاتے ہیں۔

بہرحال مخالف اسلام اور معاند ملت طاقتوں اور لادینیت، الحاد، دنیا پرستی اور فحاشی و عیاشی کے خوفناک حملوں کے مقابلے میں ہماری واحد قوت حیات، سامانِ بقا اور مقتضائے دین "جہاد" ہے۔ خواہ وہ کسی شکل اور کسی مرحلے میں ہو!

ماہِ جہاد ابھی گذرا ہے اور اس میں قرآن کو پڑھنے اور سننے اور سمجھنے والوں نے یہ سبق پا لیا ہو گا کہ جہاد سب سے بڑی عبادت ہے اور دوسری ساری عبادتیں آدمی کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں۔ جہاد جہاں آتا ہے، دنیا پرستی ختم ہو جاتی ہے۔ لذات کی ہوس باقی نہیں رہتی، بات بات پر اختلافات اور بال کی کھال اتارا کرنے کے مشغلے کالعدم ہو جاتے ہیں، موت کا خوف دور ہو جاتا ہے، برکات نازل ہوتی ہیں، رحمت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ ملی غیرت اور دینی حمیت جاگ اٹھتی ہے۔ ایک طرف دین میں رتبۂ بلند ہے تو جہاد والوں کے لیے اور دوسری طرف دنیا میں عزت و وقار ہے تو اہلِ نبرد کے لیے۔

جہاد ــ یا جہاد کی نیت ــ یا جہاد کی حمایت ــ یا مجاہدین کی امداد ــ یا ان کے

لیے مسلمانانِ عالم اور صداقت و انصاف کو ماننے والے اپنائے نوع کو مادّی و اخلاقی اور اشاعتی امداد کے لیے اکسانا ___ یا اجتماعات اور مظاہروں کے انتظامات کرانا ___ یا اشاعتی مہمات چلانا۔

یہ سب نسخۂ جہاد کے اجزا ہیں جیسے جزوِ اعظم ملا اس کا تو بیڑا پار ہے، ورنہ عنداللہ اپنی نجات کے لیے یہ لازم ہے کہ اس نسخہ کے جن دوسرے اجزا کو اختیار کیا جا سکے، ضرور کیا جائے۔

جہاد کو تو تادمِ آخر جاری رہنا ہے جیسا کہ حدیث میں خبر دے دی گئی ہے، کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں ہوگا۔ مگر آج ہمارے چاروں طرف اسلام دشمن اور جبر کیش طاقتوں کے خلاف کہیں مسلمان اکثریتیں اور کہیں اقلیتیں مظلومی کے مورچوں سے جن بہت سے معرکہ ہائے جہاد میں قربانیاں پیش کر رہی ہیں، اِن میں سے فوری توجہ طلب اس وقت مجاہدینِ کشمیر کا بھارت کے وحشیانہ اور ناجائز تسلط کے خلاف معرکۂ آزادی بپا کرنا ہے۔ ایک طرف تعدادِ افواج اور اسلحہ اور وسائل کے لحاظ سے گویا ابرہہ کا ہاتھیوں کا لشکر ہے اور دوسری طرف ایک ابابیل فورس ہے جس نے نئے دَور کے ٹینکوں والے ابرہہ کے عساکرِ جبر تبت کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ مگر مسلمانوں سے نفرت اور پاکستان سے دشمنی رکھنے والے متعصب جنونی ہندوؤں کی طرف سے انتہائی بہیمیت کے سیاہ لاوے کی لہریں پے در پے پھولوں اور چشموں اور چناروں اور زعفرانوں کی جنت میں داخل ہو رہی ہیں۔ اور دُنیا کا یہ حال ہے کہ آزادی کے علمبردار، جمہوریت کے دعویدار اقوام کے حقِ خود اختیاری کے وکلاء، تہذیب کے اُستاد، علوم کے ماہر، سائنس کے اربابِ کمال، اقوامِ متحدہ کے سرپرستانِ امن ___ بلکہ خود عالمِ اسلام کے بڑے بڑے اصحابِ ایمان و علم اور اربابِ جاہ و اقتدار دم بخود یوں دیکھ رہے ہیں جیسے تاریخ کے سنیما ہاؤس میں دل بہلانے کے لیے کوئی فلم دکھائی جا رہی ہو۔ اوروں کو تو کیا کہیے، بہ حیثیت قوم و مملکت ہم جو اہلِ کشمیر کے پڑوسی بھی ہیں، بلکہ پہلے سے

کشمیر کا ایک حصّہ ہمارے ساتھ ہے اور بقیہ باشندگانِ مقبوضہ کشمیر بھی ہم سے آملنے کے لیے بے چین ہیں، انہوں نے ہمارے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرنے کے لیے اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی مقرر کر لی ہے اور بھارت کے مقررہ وقت کو چھوڑ کر اپنی گھڑیاں ہمارے وقت کے ساتھ ملالی ہیں، اور پھر وہ ہمارے سچّے دینی بھائی بھی ہیں جن کے ساتھ ہمارا رشتہ اخوت حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کلمہ طیبہ سے قائم ہوا ہے — آخر ہمارا اب تک کا کارنامہ کیا ہے؟

اب انہوں نے حقِ آزادی اور حقِ خود ارادی کے حصول کے لیے جانوں، مالوں اور نوامیس کی ساری متاع جھونک دی ہے۔ اگر اس مرحلے میں ہم اپنا فرض ادا نہ کر سکے تو ناراستی و ناانصافی کے تارکول کا منحوس سیلاب ان کے سروں سے گذر جائے گا۔ (خدا نہ کرے) اور اگر ہم نے کوتاہی کی تو ہمارا وقار اور ہمارے حوصلے پستی میں گر جائیں گے اور جنوب مشرقی دنیا کا ابرہہ اپنی دفاعی قوت کے ہاتھیوں کو ساتھ لے کر کسی بھی لمحے خود ہماری طرف بڑھ سکتا ہے۔ چانکیائی سیاست کے اژدھا سے آس پاس کے کسی ملک کو پناہ نہ ملے گی۔

اندریں احوال ضروری ہے کہ ہم کشمیریوں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھیں، ان کے زخموں کو اپنے دل و جگر پر محسوس کریں۔ اور ان کے مطالبۂ حقِ خود اختیاری کے لیے چند روز کے اندر اندر دنیا بھر میں ہم ایسا شور اٹھا دیں کہ ظلم و بہیمیت کی اس نوخیز قوت کا سر جھکا جائے جو برِاعظم ایشیا کی گود میں پل کر ابھر رہی ہے۔

مسئلہ کشمیر کو سمجھنے کے لیے ہمارے لیے بہترین ممدو معاون تاریخی ریکارڈ ہے جو بھارت کی کثیر التعداد مسلم اقلیت کے ساتھ برسوں پر پھیلے ہوئے بہیمانہ سلوک کا آئینہ دار ہے — بلکہ پاکستان کی تشکیل سے پہلے، تشکیل کے وقت اور تشکیل کے بعد جو ظالمانہ سازشی کارروائیاں بھارت نے ہمارے ساتھ کی ہیں ان کی ایک بڑی مثال پاکستان سے اس کے مشرقی حصّے کو جدا کرنا ہے جس کے متعلق اندرا آنجہانی نے کہا تھا کہ ہم

نے ایک ہزار سال کا بدلہ مسلمانوں سے لے لیا ہے۔ ستم تو یہ کہ بھارت مالدیپ سری لنکا اور بھوٹان کے خلاف توسیع مملکت کی بھوک مٹانے کے لیے جو اقدامات کر چکا ہے اور ابھی تازہ تازہ جو کارروائی اس نے نیپال میں کی ہے، یہ حالات بتلاتے ہیں کہ ہمارے اس پڑوسی کو انسانیت کے حقوق اور اقدار کا سرے سے لحاظ ہی نہیں ہے۔ بس ایک پاگل گینڈا ہے جو ہر طرف لوگوں کے حقوق کو روندتا پھرتا ہے۔

کشمیر کے باشندوں نے اپنی آزادی کے لیے بڑی طویل جنگ لڑی ہے مگر اُن کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ ایک مرتبہ انگریزوں نے ریاست کو قوم سمیت نقد قیمت لے کر ڈوگروں کے ہاتھ اس طرح فروخت کیا جیسے اینٹ پتھر یا بھیڑ بکریاں فروخت کی جاتی ہیں۔ قوم فروشی کا ایسا گھٹیا ریکارڈ شاید اور کسی شہنشاہیت کے ہاں نہ ملے۔ پھر اسی انگریز حکومت کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن) نے پنڈت نہرو کے ساتھ ایسا سیاسی رومانس لڑایا کہ ریڈ کلف کے ذریعے تقسیم برصغیر کی لکیر نہایت غیر منصفانہ شکل میں کھینچی گئی اور خاص اہتمام سے پٹھانکوٹ کے راستے سری نگر سے زمینی رابطہ کی صورت پیدا کر کے بھارتی مگرمچھ کے لیے ریاست جموں و کشمیر کو نگلنے کا موقع مہیا کر دیا گیا۔ ریڈ کلف کی یہ ناانصافی ویسی ہی مجرمانہ ہے جیسا کہ فلسطین کے لیے اعلان بالفور تھا۔ بعدازاں قائداعظمؒ نے یہ چاہا کہ باشندگان کشمیر کو جو مظاہرات اور جلسے جلوسوں کے ذریعہ جمہوری طور پر یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ بھارت کا استبداد قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔۔ انہیں بھارت کی فوجی جارحیت سے تحفظ دلایا جائے۔ انہوں نے پاکستان کے قائم مقام کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی کو حکم دیا کہ وہ پاکستانی فوج کی ۲ بٹالین سری نگر بھیج دے۔ گریسی نے انکار کر دیا۔ یہی گریسی ہے جس نے وادی کشمیر میں قبائلیوں کی پیش قدمی کی پہلی خبر بھارت کے سینا پتی لاک ہارٹ تک خفیہ ٹیلی فون کے ذریعے پہنچائی۔ اب قائداعظم کے حکم کو ماننے سے اُس نے انکار کر دیا۔ اور اس کی اطلاع فیلڈ مارشل آکنلک کو دہلی

ہیں پہنچا دی۔ آکنلک نے جیف آف سٹاف لندن ایک سگنل بھیجا جس میں گریسی کو قائداعظم کے دیئے ہوئے حکم کی خطرناکی کی اطلاع دی۔ آکنلک ۲۸ اکتوبر کو لاہور آکر گریسی سے ملا۔ پھر اس نے قائداعظم سے ملاقات کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آپ نے حکم واپس نہ لیا تو تمام انگریز افسر پاکستانی فوج سے واپس بلا لیے جائیں گے۔ مجبوراً قائداعظم نے احکام تو واپس لے لیے، مگر وہ سخت طیش کی حالت میں تھے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ پاکستان کو بھی اور کشمیر کو بھی ایک سازش میں جکڑا جا رہا ہے۔

سازش کی کڑیاں ــــ جواہر لعل نہرو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ریڈکلف، ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ (جس نے پاکستان کے معاہدۂ قائمہ توڑ کر ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی دستاویز لکھی)، جنرل گریسی، فیلڈ مارشل آکنلک۔

یعنی برطانیہ جو اس وقت ایک بڑی طاقت بلکہ شہسوارِ تہذیب بنا ہوا تھا۔ اس کے عالی مرتبت سپوت چانکیائی مزاج کی قومِ ہنود کے لیڈر کے ساتھ راستی و انصاف اور آزادی و جمہوریت کے اصولوں کو پامال کر کے محض اس لیے سازشی گٹھ جوڑ کر رہے تھے کہ ایک تو بھارت بڑا ملک اور بڑی مارکیٹ تھا۔ اور دوسرے امپیریلسٹ طاقتوں نے مسلمانوں سے بحالتِ مظلومی و غلامی بھی ایسے زخم کھائے تھے کہ ان کا تدارک اپنے ہم مزاج ہندوؤں ہی سے مل سکتا تھا اور عرصہ سے وہ برصغیر میں ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔

۴۸-۱۹۴۷ء کی اس نزاع کی روک تھام اقوامِ متحدہ نے کی۔ بھارت خود سارا مقدمہ لے کر گیا، جواباً پاکستان نے اصولِ تقسیمِ برصغیر اور ریاستوں کے عوام کے حقِ خود اختیاری کو نمایاں کیا۔ بالآخر ایک قرارداد کے ذریعے طے پایا کہ مسئلہ کشمیر کا حل ایک غیر جانب دارانہ استصواب کے ذریعے ہوگا۔ جس میں ریاست جموں و کشمیر کے باشندے اپنی آزاد مرضی سے خود فیصلہ کریں گے کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔

لیکن بھارت اور بھارت نواز عالمی طاقتوں نے یہ شرمناک مثال قائم کی کہ استصواب

کے ریزولیوشن کے پاس ہو جانے کے بعد عملاً استصواب منعقد کرانے کا فرض تقریباً ۴۲ سال کے لیے ملتوی چلا آرہا ہے۔ اس تاخیرِ بے جا نے مزید سازشوں اور بے انصافیوں کے راستے کھول دیئے۔

بھارت کے واحد معتمد علیہ سیاسی رہنما ئے کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۸ مئی ۱۹۵۴ء تک دسیوں مرتبہ ریاست جموں وکشمیر میں استصواب کرانے کا حتمی اقرار و اعلان کیا۔ ان بار بار کے اعلانات میں سے ہم صرف ایک مختصر اقتباس سامنے لاتے ہیں۔ ۲۶ جون ۱۹۵۲ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں پنڈت نہرو نے بیان دیتے ہوئے کشمیر کے مستقبل کے متعلق کہا کہ:

"اگر آزادانہ، غیر جانب دارانہ اور منصفانہ استصواب کے ذریعے کشمیری عوام نے ہمیں کہا کہ وہ بھارت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو ہم ان کا فیصلہ ہر حالت میں تسلیم کر لیں گے۔ خواہ یہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور اس میں ہمیں کتنا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ہمیں یہ فیصلہ قبول کرنا ہی ہوگا۔ اگر ایفائے عہد میں ہمیں اپنا آئین بھی تبدیل کرنا ضروری ہوا تو ہم بخوشی اس میں ترمیم کر لیں گے۔"

ذرا ان الفاظ کو پڑھیے اور اقوام متحدہ کی قرار دادِ استصواب کی روشنی میں پڑھیے تو بات تو بڑی سچی اور پختہ سامنے آتی ہے، مگر کہنے والا آنجہانی اور اس کے جانشین اور اس کی قوم سچائی کی اس نمائشی لفظی جھلی کے نیچے ایک بڑا جھوٹ چھپائے ہوئے تھے۔ سازش کہتے ہی اسی کو ہیں کہ آپ کسی ظلم و فساد اور دروغ و فریب کے لیے لفظوں کا بہت خوب صورت لباس تراش کے اُوپر سے اُسے پہنا دیں۔

مگر فریب اور جھوٹ کا یہ مصنوعی لباس جسے بھارتی سیاست نے اقوام متحدہ کی قرار داد کا لحاظ کرتے ہوئے تراشا تھا۔ وہ جلد ہی تار تار ہو کر بکھر گیا اور فتنہ گری بالکل عریاں ہو کر سامنے آگئی۔ قرار دادِ استصواب پر جب کئی برس کی گرد پڑ گئی تو بھارتی سامراج نے یہ شعور رکھتے ہوئے کہ پوری سازشِ کشمیر میں برطانیہ پہلے

ہی شریک ہے اور امریکہ بھی بھارت سے بگاڑنا نہیں چاہتا، اور روس کو تو پہلے ہی ہموار کیا جا چکا تھا۔ تب یہ آواز اٹھی کہ کشمیر بھارت کا "اٹوٹ انگ" ہے۔ پھر "اٹوٹ انگ" کی رٹ بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج اٹوٹ انگ کے معنی یہ ہو گئے کہ کشمیر کے جوانوں کو بھی ہلاک کیا جائے اور شکار تعذیب بنایا جائے۔ عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی اس طرح بھون ڈالا جائے جیسے کوئی بندوقچی تلیروں اور کبوتروں کا شکار کرتا ہے۔

یہ صریحاً ایک قوم کی نسل کشی کی مہم ہے اور یہ سزا ہے اس بات کی کہ اس کا بچہ بچہ آج آزادی اور حق خود اختیاری کا مطالبہ لے کے کیوں سر بکف ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

اب یہ معاملہ ایسی جگہ آ پہنچا ہے کہ نہ صرف اہل پاکستان، بلکہ پورے عالم اسلام اور ساری نوع انسانی کو حرکت میں آ جانا چاہیے۔

چند اصولی نکات پر خاص توجہ دی جائے اور انہیں بھارت کے سامنے، اسلامی ممالک کے سامنے، مغربی دنیا اور اقوام متحدہ کے سامنے وفود، سفارتی ذرائع، پبلسٹی، قراردادوں، اداریوں، محضرناموں اور تاروں کے ذریعے، افراد اور اجتماعات اور کنونشنوں، اداروں اور بین الاقوامی مجالس کے ذریعے واضح مطالبوں کی صورت میں نمایاں کیا جائے۔

۱۔ اہلِ کشمیر کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلامیۂ آزادی، اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور سلامتی کونسل کی پاس کردہ قرارداد استصواب کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں، جس میں نہ کسی کو مداخلت کا حق ہے، نہ رکاوٹ ڈالنے کا۔

۲۔ مسئلہ کشمیر کو طے کرنا نہ تو بھارت اور پاکستان کے معاہدوں کے ذریعے ہو سکتا ہے، نہ امریکہ یا کسی اور طاقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے، بذریعہ استصواب یہ فیصلہ کرنا صرف اہلِ کشمیر کا کام ہے۔

۳۔ اہلِ کشمیر نے گذشتہ ریاستی انتخابات کا ریکارڈ حد تک بھرپور بائیکاٹ

کر کے فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ الحاق کے بندھن میں بندھے نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ انہوں نے اتوار کی جگہ جمعہ کو چھٹی کرنے اور بھارتی وقت کو ترک کر کے پاکستان کے وقت کے مطابق اپنی گھڑیوں کو سیٹ کرنے کی صورت میں پاکستان کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کر دیا ہے۔ بھارت کو چاہیے تھا کہ اس فیصلے کو چپ چاپ تسلیم کر لیتا۔

۴ — اہل کشمیر ہرگز معاہدۂ تاشقند یا شملہ سمجھوتے کے پابند نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ان میں فریق تھے ہی نہیں۔

۵ — اگر بھارت اٹوٹ انگ کی رٹ چھوڑ کر استصواب کے لیے تیار ہو جائے تو اسے یا اقوام متحدہ کو فوری طور استصواب کی تاریخ کا اعلان کر دینا چاہیے۔

۶ — استصواب کے انعقاد تک بھارت کو محض ایک عبوری (CARETAKER) حکومت کی حیثیت سے رہنا چاہیے اور استبداد سے کام لے کر لوگوں کو ہلاک، اسیر اور نظر بند کرنے سے پورا پرہیز کرنا چاہیے۔

۷ — اس دوران میں پاکستان کے ایک نمائندہ دفتر کو وہاں کے حالات سے آگاہ رہنے کے لیے موجود رہنا چاہیے۔

۸ — دنیا کے ہر ملک کے اخباری رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کو ریاست جموں و کشمیر میں جا کر آزادی سے خبریں اور تصویریں حاصل کرنے، انٹرویو لینے اور رپورٹیں تیار کر کے باہر بھیجنے یا لے جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

۹ — عالمی ریڈ کراس اور انجمن ہلال احمر کو سہولتیں دی جائیں کہ وہ اہل کشمیر کو غذائی طبی یا کسی دوسری طرح کی امداد بہم پہنچا سکیں۔

۱۰ — ایک کمیشن عالم متحدہ کی طرف سے ۷ یا ۱۱ افراد پر مشتمل ایسا مقرر کیا جائے۔ جس میں مسلم ممالک کی بھی مناسب نمائندگی موجود ہو۔ یہ کمیشن تمام واقعات و احوال کا جائزہ لے، مرنے والوں، زخمی ہو جانے والوں، بہیمیت کا شکار ہونے والی خواتین، جلائے جانے والے مکانات یا دکانوں، نظر بندوں اور قیدیوں اور ان کے

ساتھ ہونے والے سلوک اور ان کے وجوہ نظر بندی یا کسی جرم پر گرفتاری کی شکل میں ایف آئی آر کی پڑتال کی جائے۔

یہ کمیشن تمام نقصانات کے لیے تاوان (COMPENSATION) کی رقوم کا تعین کرے اور بھارت کو مجبور کیا جائے کہ وہ یہ تاوان فرد فرد کو ادا کرے۔

۱۱- اس درمیانی وقت میں اقوام متحدہ ایسے ممالک کے اور ایسے مسلک کے کافی فوجی نگرانوں کا تقرر کشمیر میں کرے جو حالات کی روزہ مرہ رپورٹ اقوام متحدہ، حکومت بھارت اور حکومت پاکستان کو، نیز ضروری اطلاعات پریس کو فراہم کرے۔

ان مطالبات کے لیے پاکستان اور بیرون پاکستان میں اس تیز رفتاری سے کام ہونا چاہیے کہ چند روز میں کوئی حل عمل میں آجائے، ورنہ ہر روز تباہی میں جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کی مجرم حکومت بھارت کے علاوہ پوری دنیائے انسانیت بھی ہے۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

مولانا مودودیؒ اور اقبال کی فکری یکسانی

مرتبہ: قاری عبدالحمید۔ ایم۔ اے

ترجمانِ حقیقت علاّمہ اقبال

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے، اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائے۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

حوالے:

۱۔ روزنامہ احسان، لاہور بابت ۹ر مارچ ۱۹۳۸ء

۲۔ مقالاتِ اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۴۳، ۲۴۴

۳۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ، از محمد احمد خاں ص ۵۹۲

۴۔ اقبال کے نثری افکار، مرتبہ عبدالغفار شکیل: مضمون، اسلام اور قومیت۔

(۲)

مفکرِ اسلام مولانا مودودیؒ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے۔ مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں، جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے۔ عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزلِ مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادیٔ ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رُو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے۔

(بشکریہ ایشیا - ۲۴ر اپریل ۱۹۸۳ء)

حوالے:

۱- ماہنامہ ترجمان القرآن - اشارات اپریل ۱۹۳۷ء

۲- مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ اوّل طبع اوّل فروری ۱۹۳۸ء ص ۳۵، ۴۳۔

۳- تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان حصہ اول، طبع نہم ص ۶۳، ۶۸۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تعلیم کی زبوں حالی

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

جس زمانہ میں ہندوستان میں مسلم لیگ کی نشأۃِ ثانیہ عمل میں آئی، اسی زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی اُبھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کے تحت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ سات بڑے صوبوں میں کانگریس پارٹی نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ حکمران بن جانے کے بعد کانگریس پارٹی نے جس مسئلہ پر سب سے زیادہ توجہ صرف کی وہ متحدہ قومیت کو فروغ دینا تھا۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قومیں گھل مل کر ایک قوم بن جائیں۔ اس کے لیے ملک میں تعلیم کی دو اسکیمیں رائج کی گئیں۔ گاندھی کی واردھا اسکیم اور پنڈت شکلا کی ودیا مندر اسکیم۔ ہر طرح ہندو تہذیب کی اشاعت مطلوب تھی۔ اسکولوں میں سرسوتی دیوی (علم کی دیوی) کی پوجا کی جاتی تھی۔ ہندو طور طریقے اور آداب سکھلائے جاتے تھے۔ توحید پرست مسلمان یہ پوجا پاٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان جدید اسکیموں سے سخت برہم تھے۔

ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے مسلمان ماہرینِ تعلیم پر مشتمل ایک وسیع کمیٹی نواب کمال یار جنگ حیدر آبادی کی سربراہی میں تشکیل دی۔ کمیٹی نے ہندوستان میں خاص کر اقلیتوں کے صوبوں میں گھوم پھر کر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تعلیم کے مسئلہ کا جائزہ لیا۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کمیٹی تندہی سے اپنا کام کرتی رہی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے کبھی اس سے پہلے کسی قومی مسئلہ کا اس سنجیدگی

کے ساتھ اور اس محنت و مشقت کے ساتھ جائزہ نہیں لیا۔ بہر کیف کمیٹی نے ۱۹۴۳ء میں اپنا کام مکمل کیا۔ اپنی تجاویز پیش کیں۔ اور رپورٹ شائع کر دی۔

اس وقت تک مسلم لیگ طاقت ور ہو چکی تھی۔ تحریکِ پاکستان نے زور پکڑ لیا تھا۔ یہ رپورٹ مسلم لیگ کے سامنے پیش ہوئی۔ اس نے اس پر غور کیا۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس میں ملک کے نامور ماہرینِ تعلیم کو شریک کیا گیا۔ اس کے کنوینر ڈاکٹر افضال حسین قادری پروفیسر یونیورسٹی علی گڑھ مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں نے تعلیمی مسائل پر ایک کتابچہ تحریر فرمایا تھا

The Problems of Education

By Nawab Zada Liaquat Ali Khan

Ashraf Publication - Lahore - 1943

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلم لیگ کی تعلیمی کمیٹی نے کس قدر کام کیا۔ اور آیا اس کی رپورٹ شائع ہوئی یا نہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔

تعلیم کا مسئلہ مسلم لیگی ارکان کے ذہنوں میں تازہ موجود تھا۔ اس لیے پاکستان کو بنے ابھی چار ماہ کی مدت بھی نہیں گزری تھی، ہندوستان میں مسلمانوں کی قتل و غارت گری جاری تھی۔ پاکستان میں حکومت کی مشینری پوری طرح جمنے نہیں پائی تھی کہ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کر کے پاکستان کے پہلے وزیر عالی جناب فضل الرحمٰن نے "آل پاکستان تعلیمی کانفرنس" ۲۷ رنومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں بلائی، جس میں ملک کے تمام تعلیمی ماہرین اور تعلیم سے متعلق اعلیٰ عہدہ داران شریک ہوئے۔

اس کانفرنس نے بڑے واضح الفاظ میں تعلیم کے مقاصد کا اعلان کیا۔

"We have, now, before us the opportunity of reorienting our entire educational policy to correspondent closely with the needs of the times and to reflect the ideals for which Pakistan as an Islamic state stands. **page -3-**

New Education in the Making of Pakistan

By Fazlur Rehman

Cassell & Company Hd.

London - 1953

"اب ہمارے سامنے پوری طرح مواقع موجود ہیں کہ ہم تعلیمی پالیسی کو زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اور اسلامی نظریۂ حیات کا آئینہ دار بنائیں جس غرض کے لیے پاکستان کی اسلامی ریاست وجود میں آئی ہے"۔

ایڈوائزری بورڈ برائے تعلیم کے پہلے سالانہ جلسہ منعقدہ ۷، ۸ جون ۱۹۴۸ء میں فضل الرحمٰن نے سابق کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

" میں نے تجویز پیش کی کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں اسلام کی روح جاری ہونی چاہیے، خاص طور پر اس کی صفاتِ عالمگیر اخوت، انصاف اور روا داری کے اصولوں کے ساتھ، تعلیمی کانفرنس نے متفقہ طور پر اس تجویز کی حمایت کی بصورت قرارداد جس کی توثیق تعلیمی مشاورتی بورڈ نے کی اور جس کو پھر مرکزی حکومت نے تسلیم کرلیا"۔ ص - ۲۱ -

یہ اقدام نہایت صحیح رُخ پر تھا - مسلم لیگ کی سابق روایات اور تحریکِ پاکستان کے مطالبات کے عین مطابق تھا - اس کی جس قدر ستائش کی جائے وہ کم ہے -

یہ صرف مقصد تعلیم کا اعلان ہوا - اب اس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیے تھی - نظامِ تعلیم میں اسلامی رُوح داخل کرنے کے لیے ایک اکیڈمی بنانی چاہیے تھی جہاں ماہرینِ تعلیم اور دینی علماء جمع ہوکر وہ اسباب اور ذرائع سوچتے جن سے یہ مقصد حاصل ہوتا - متعدد کمیٹیاں تشکیل دی جاتیں جو اس مقصد کو تعلیم کے مختلف شعبوں اور شاخوں میں پیوست کرتیں - ایک مدت تک محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا جاتا تب یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم اسلامی اقدارِ حیات کے مطابق بن جائے گا۔

مگر قوم کی بدبختی، یہ عظیم الشان اقدام زبانی اقرار سے آگے نہ بڑھ سکا - وہی لارڈ میکالے کا برطانوی نظامِ تعلیم بعینہٖ پاکستان میں جاری اور ساری ہے - اس میں کسی قسم

کا تغیر نہیں ہوا ۔ دینیات کی تعلیم میں بھی کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوا ۔ پاکستان بن جانے کے تیرہ سال بعد تک وہی برطانوی دور کا نصابِ تعلیم، وہی مضامین اور کتابیں پاکستان میں پڑھائی جاتی رہیں ۔ انگلستان کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی اور اسلامی تاریخ کو داخلہ نہیں ملا ۔ البتہ تعلیم میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی رہی ۔ نئے نئے ضلعوں اور علاقوں میں اسکول اور کالج کھلتے رہے ۔ مگر وہی برطانوی نظامِ تعلیم کا حلقہ وسیع ہوتا رہا ۔

پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ نے اور پاکستان کے مسلمانوں نے پاکستان کے مقاصد کے ساتھ بے وفائی کی ۔

؎ یہ اُمت گر گئی سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

پھر سیاسی حکومتوں کا خاتمہ ہوا اور فوجی حکومتوں کا آغاز ہوا ۔ ایوب خاں نے فوجی حکومت قائم کی تو اُس نے ایک تعلیمی کمیشن بھی قائم کیا ۔ اس کمیشن نے نئی تعلیمی اسکیم پیش کی جس پر عمل درآمد ہوا ۔ یہ شریف کمیشن رپورٹ (۱۹۵۹ء) کہلاتی ہے ۔

اس رپورٹ کی تیاری میں :

— امریکی حکومت کے ماہرینِ تعلیم نے امداد کی ۔

فورڈ فاؤنڈیشن امریکہ کے ماہرینِ تعلیم نے امداد کی ۔

یونیسکو کے ماہرینِ تعلیم نے امداد کی ۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظامِ تعلیم کی تیاری میں امریکہ، فورڈ فاؤنڈیشن اور یونیسکو سب دلچسپی لے رہے ہیں ۔ بلکہ مشہورِ عوام تو یہ بات ہے کہ اس رپورٹ کی تسوید (ڈرافٹ) دو امریکی پروفیسروں نے کی ہے ۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مقصدِ تعلیم کے متعلق اس رپورٹ میں ارشاد ہوتا ہے ۔

We have assumed that the educational system of a nation should be consonant with the country's self image; that it should be in form and content

consistent with the hopes and aspirations the country hold for itself; indeed that it is the medium through which these aspirations come to be realised. Report p - 10

"ہم نے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ کسی قوم کا نظام تعلیم اس ملک کے خود پسند تصورات کے مطابق ہو۔ یعنی صورت اور مغز دونوں میں ملک کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ہو۔ بلکہ اس کو تو وہ ذریعہ بن جانا چاہیے جس کے توسط سے وہ تمنائیں بروئے کار آسکیں"۔

اس رپورٹ میں تعلیم کے مقصد کو نہایت خوبصورت الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ کسی بھی قوم کے نظام تعلیم پر صادق آسکتے ہیں۔ پہلی تعلیمی کانفرنس میں مقصد تعلیم کا جو واضح اور صریح اعلان کیا گیا تھا۔ یہاں اس کو برقرار نہیں رکھا گیا۔ پہلے مقصد کی حد تک تو بات واضح تھی۔ اب وہ بھی باقی نہیں رہی۔ اس رپورٹ میں اسلامی تعلیم کے متعلق وہی بے نیازی کا عالم رہا۔ کوئی مثبت تجویز پیش نہیں کی گئی۔ البتہ دوسرے اُمور کے متعلق نئی نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ نظام تعلیم کو امریکی لوازمات بنانے کی پوری کوشش کی گئی۔

۱۹۷۸ء کے بعد صدر ضیاء الحق چین کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے نظریاتی تعلیم کی اثر انگیزی کو بچشم سر دیکھا۔ نظریاتی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ انہوں نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ مطالعۂ اسلام اور مطالعۂ پاکستان کو کالجوں کے نصاب میں شامل کرایا۔ اس طرح ۳۱ سال گذر جانے کے بعد پاکستان کے مقصد وجود، نظریۂ پاکستان کی تعلیم کو نصاب تعلیم میں داخلہ کی اجازت ملی۔ اس طرح اوّل دن سے پاکستان میں اسلامی اور نظریاتی تعلیم کی ناقدری ہوتی رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے انفرادی تشخص اور تہذیبی تشخص برقرار رکھنے میں نتیجۃً خارجی عوامل کی کمک حاصل رہی ہے۔

۱۔ حکمرانی پہ انگریز کا فائز ہونا:

انگریز کی موجودگی مسلمانوں کو ہر دم یہ تاریخی حقیقت یاد دلاتی رہتی تھی کہ کبھی یہ ملک اُن کی حکمرانی میں تھا۔ انگریز نے ان سے حکومت چھینی ہے، لاشعور میں یہ بات موجود رہتی تھی۔ نظریہ ضرورت کے تحت وہ انگریزی حکومت سے تعاون کر رہے تھے، مگر وہ انگریزی حکومت کو انشراح صدر کے ساتھ قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اعلیٰ طبقہ میں کسی قدر مغربی تہذیب نے نفوذ کیا تھا ورنہ ادنیٰ طبقہ اور متوسط طبقہ بدستور اپنی تہذیب پہ قائم تھا اور نازاں تھا کہ وہ مغربی تہذیب سے بہت کم متاثر ہوئے۔

۲۔ مسلمانوں کا اقلیت میں ہونا:

تمام ہندوستانی انگریز کے محکوم تھے۔ مگر محکوموں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔ اقلیت کو اکثریت سے اندیشے ہوتے تھے۔ اس لیے انفرادی تشخص کے برقرار رکھنے کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے بہت اہم تھا۔ غیر شعوری طور پہ ایک ایک مسلمان اس اندیشے کے تحت معاملہ کرتا تھا۔ اور ہر قیمت پہ اپنے اسلامی تشخص کا تحفظ کرتا تھا۔ اس طرح انگریزی اور ہندو تہذیبی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

۳۔ ہندو کی ہمسائیگی:

ہندو وہ قوم تھی جو صدیوں مسلمانوں کی محکوم رہی تھی۔ مگر اب وہ انگریزی دور میں ہر طرح مسلمانوں کو زیر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر میدان میں مسلمان کے ساتھ اس کا مقابلہ تھا۔ ہندو کے غالب آجانے کے نتائج کو مسلمان بخوبی سمجھتا تھا۔ اس لیے یہاں بھی اُس کو اسلامی تشخص محفوظ رکھنے کی خواہش متحرک رکھتی تھی۔ مقابلہ کا تصوّر اُس کے قوائے عمل کو مہمیز دیتا تھا۔ ان تین عوامل کے باعث مسلمان بیک وقت انگریز اور ہندو کے خلاف اپنا قومی اور ملّی وجود برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس میں تساہل نہیں برتتے تھے۔

(باقی بر صفحہ ۴۹)

سہیل حنیف شہید

جناب حافظ محمد ادریس صاحب

دُنیائے فانی میں ہر روز لاکھوں نومولود وارد ہوتے ہیں اور ہر روز لاکھوں انسان یہاں سے رخصتِ سفر باندھ کر راہیٔ مُلکِ بقا ہوجاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے ابد تک جاری رہے گا ——— موت ایک اٹل حقیقت ہے مگر اس کی آمد کا پتہ سوائے خالقِ موت و حیات کے کسی کو نہیں ہوتا۔ بعض لوگ بظاہر زندہ نظر آتے ہیں مگر مُردوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بظاہر یہاں سے کوچ کر کے موت کی خاموش وادی میں اُتر جاتے ہیں مگر زندہ جاوید ہوجاتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے شہدا کبھی نہیں مرتے۔ قرآن اس پر گواہ ہے اور حدیث اس پر شاہد۔

اسلامی جمعیت طلبہ اس مُلک کے پاک نظر و پاکباز نوجوانوں کی بے مثال تحریک ہے۔ بے داغ جوانیوں اور تابندہ جبینوں والے یہ نوجوان اس معاشرے کا حُسن اور اس قوم کے روشن مستقبل کی دلیل ہیں۔ تعلیمی اداروں کے غیر اسلامی ماحول اور انگریزی دور کے لادینی نظامِ تعلیم کے باوجود ان نوجوانوں نے اپنی آہِ سحر گاہی اور عشقِ مصطفےٰ سے ماحول کو منوّر اور معطّر کر دیا ہے۔ قرآن و حدیث کی خوشبو اور صبغۃ اللہ کی جھلک اگر نظر آتی ہے تو انہی دیوانوں کے دم قدم سے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ نوجوان فرشتے ہیں یا خطا سے مبرّا ہیں۔ یہ انسان ہیں اور ہر انسان خطا کا پُتلا ہے مگر مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کا مجموعی وزن خیر کے پلڑے میں ہے۔ یہ شر کے دشمن اور بُرائی سے نبرد آزما ہیں۔ باطل نے بجا طور پر ان کے خلاف ایک مضبوط محاذ کھول رکھا ہے۔ ان پر گولیوں کی

بوچھاڑ بھی ہوتی ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی یلغار بھی۔ باطل کے اس منظم اور مسلسل پروپیگنڈے سے بہت سے غیر جانب دار لوگ بھی متاثر ہو چکے ہیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ بعض نیک اور خیر پسند لوگ بھی اس برین واشنگ کا شکار ہو کر شرپسندوں کی مکروہ آواز میں اپنی بھولی بھالی صدا شامل کر دیتے ہیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں، صبر و استقامت کے ساتھ مصائب کے پہاڑ اٹھائے ہیں اور شمع حق روشن رکھی ہے۔ ایک جوکھی لڑائی ہے جو جمعیت کے کارکن اس ملک میں لڑ رہے ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا جب کسی بے گناہ نوجوان کا جسم ظلم کی گولیوں سے چھلنی نہ ہوتا ہو، کوئی رات ہی ایسی گذرتی ہوگی جب جمعیت کے کارکن اپنے کسی شہید کا جنازہ نہ اٹھاتے ہوں۔ یہ جنگ حق و باطل کی جنگ ہے۔ اس میں کون کس کے ساتھ ہے بڑا اہم سوال ہے۔

مدت بیت گئی ہے کہ میں ہر شام تھک ہار کر جب اپنے بستر پر گرتا ہوں تو مسنون دعائیں پڑھتے ہوئے یہی خدشہ دل میں ہوتا ہے کہ نہ معلوم ابھی فون کی گھنٹی بجے گی تو کیا خبر سننے کو ملے گی ہنسی خوشی قہقہے، مذاق قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ کتنی ماؤں کے جگر گوشے گولیوں کا نشانہ بن گئے، کتنی بہنوں کے ارمان دفن ہو گئے، کتنے باپ اپنی لاٹھی سے محروم ہو گئے۔ کتنے بھائیوں کے بازو چھن گئے۔

میری آنکھوں کے سامنے شہداء کا قافلہ ہر شام گذرتا ہے۔ ایک ایک کو دیکھتا ہوں۔ ہر جوانِ رعنا اپنی مثال آپ۔ خوش و خرم افق کی بلندیوں سے جھانکتے ہوئے یہ نوجوان کتنے پیارے، کتنے عظیم، کتنے بھلے اور کتنے خوش قسمت نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی مائیں؟ ان کی بہنیں؟ ان کا پورا خاندان؟ کس کرب و اندوہ سے دوچار ہے؟

قافلۂ شہداء کا نہایت پیارا اور سدا بہار ساتھی سہیل حنیف مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس جوان سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ میرے ذہن میں صالح نوجوان کا جو تصور ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس کی بھرپور ترجمانی سہیل حنیف کی صورت میں میں نے دیکھی۔ اتنا پیارا بچہ جس ماں نے جنا وہ ماں مبارک باد کی مستحق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں وہ دن جب یہ بچہ پیدا ہوا باعثِ برکت تھا، جب وہ رخصت ہوا تو اس دن کو بھی مبارک کر گیا اور جس روز یہ دوبارہ زندہ ہوگا تو وہ لمحات بھی باعثِ برکت و مسرت ہوں گے۔

مومن کی بہت سی صفات قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ آج میں ان صفات پر نظر ڈالتا ہوں اور پھر سہیل حنیف کی یادوں کا دریچہ کھولتا ہوں تو مجھے وہ ان صفات کا مرقع نظر آتا ہے۔ اللہ کی عبادت میں اپنی جوانی کھپا دینے والا، رات دن اللہ کے کلمے کی سربلندی کی لگن میں سرشار، دن کو گھوڑے (موٹر سائیکل) کی پیٹھ پر سوار اور رات کو مصلّے پر اشک بار، اللہ رب العزت کا عبادت گزار، سرکار دو عالم کا اطاعت شعار، ماں باپ کا فرماں بردار، بڑوں کے سامنے مودّب، چھوٹوں کے ساتھ مشفق، فرض شناس و ملنسار، یاروں کا یار، باطل کی آنکھوں میں خار۔ ظاہر میں بھی پاک صاف، باطن میں بھی پرہیزگار۔ خوشیوں میں سب کے ساتھ شریک، مشکل میں سب کا غم خوار۔ شہد کی مکھی کی طرح کام میں مگن ومحو، بیت المال کو مضبوط کرنے کے لیے ہردم رواں دواں، پائی پائی کا حساب رکھنے والا، قابلِ اعتماد، امین اور دیانت دار، نہ جھگڑالو، نہ ضدی، نہ عیب چیں، نہ لہو و لعب کا عادی، نہ دُوں ہمت، نہ سہل انگار۔ وہ خاموشی سے سوچ بچار کا عادی تھا اور بات میں ہمیشہ شیریں گفتار۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا مستقل بسیرا تھا۔ خندہ رُو، روشن جبیں، بلند نگاہ، عالی ہمت، صاحب کردار۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ سہیل کبھی مجھ سے ملا ہو، اور اس کی ملاقات سے قلبی مسرت نہ حاصل ہوتی ہو۔ دُبلے پتلے اور نحیف و نزار جسم میں وہ شیر کا دل، چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس رکھتا تھا۔ مجھ سے جب بھی ملتا میں کہتا "سہیل تم ڈائٹنگ چھوڑ دو اور کچھ کھایا کرو" وہ نہایت پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے ایسے جواب دیا کرتا کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔ میں نے جمعیت پر بڑے بڑے نازک لمحات کے دوران بھی سہیل کو دیکھا اُس کے چہرے سے طمانیت وسکینت کبھی غائب نہ ہوتی۔ وہ تھا ہی عظمت کا پیکر۔ میں محترم میاں طفیل محمد صاحب کے ہمراہ سہیل کو دیکھنے سروسز ہسپتال گیا۔ انتہائی نگہداشت کے حفاظتی وارڈ میں مشینوں کے رحم وکرم پر وہ بے ہوش پڑا تھا۔ مگر آج بھی اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ کرب کا کوئی نشان نہ تھا اور ۱۶ ستمبر کو جب وہ اپنے بھائیوں کے کندھوں پر سوار اپنے چاہنے والوں کو اپنا آخری دیدار کرانے محلے کے ہائی سکول کی

وسیع گراؤنڈ میں آیا تو اُس وقت بھی اس کے چہرے پر وہ دائمی مسکراہٹ تھی۔

سہیل کے جنازے کے ساتھ ہزاروں نوجوان تھے۔ میں چشمِ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ سہیل کے جنازے میں شہدا کی روحوں کا قافلہ بھی شامل ہے۔ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے ملائکہ مقربین کی جماعتیں بھی آسمان کی بلندیوں پر موجود ہیں۔ نفس مطمئنہ اپنا سفر مختصر وقت میں مکمل کر کے راضیۃً مرضیۃً جنت کی جانب محوِ پرواز ہے۔

برادر محترم محمد حنیف صاحب نے اپنے بیٹے کی شہادت پر جو باتیں کہیں وہ ہزاروں افراد نے سنیں، چھپ چکی ہیں، لاکھوں افراد پڑھ چکے ہوں گے۔ وہ باتیں تاریخِ اسلام کا تسلسل ہیں۔ یہی باتیں اسماء بنت ابوبکرؓ نے اپنے لختِ جگر عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر کہی تھیں۔ یہی باتیں خنساء بنت عمروؓ نے قادسیہ میں چار جوان سال بیٹوں کی شہادت پر کہی تھیں، یہی باتیں عروہ بن زبیرؓ نے تاریخ کے حوالے کیں۔ آج پھر ایک عظیم باپ اپنے عظیم بیٹے کی شہادت پر تاریخ کا قرضہ اُتار رہا تھا۔ سب کی آنکھوں سے آنسو تو پہلے ہی جاری تھے، حنیف صاحب کی ایمان افروز مختصر تقریر سے لوگوں کی آہیں اور سسکیاں چیخوں میں ڈھل گئیں، مگر لوگوں نے اپنے آپ کو ضبط کا پابند کر لیا اور میں نے دیکھا کہ یہ سب کچھ دیکھتا ہوا سہیل اب بھی مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

؎ چلے وہ غنچوں کی مانند مُسکرا کے چلے
پر اپنے چاہنے والوں کو خون رُلا کے چلے

برادر محترم محمد حنیف صاحب حدیثِ رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عین مطابق جنت میں بیت الحمد کے مستحق بن چکے ہیں۔ سہیل حنیف جنت میں جا چکا ہے اور اپنے والدین کا منتظر ہے۔ اب ملاقات جنت ہی کی معطر و پاکیزہ فضاؤں میں ہو گی۔

سہیل کی والدہ کے بقول اس کا چاند دولہا بن کر چلا گیا ہے۔ ہاں وہ دولہا ہی بن کر گیا ہے۔ حورانِ جنت کی رفاقت اُسے میسر آگئی ہے۔ ماں باپ کے دل کا قرار چھن گیا، آنکھوں کی ٹھنڈک لُٹ گئی، مگر یہ سودا گھاٹے کا سودا نہیں۔ یہاں جو کچھ بھی لُٹا دیا جائے وہ اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا ہے۔ بیٹا دُولہا بنے تو ماں باپ کو مبارک باد دی جاتی ہے۔ سہیل کے والدین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دین کی غربت اور تہذیب مغرب

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

دین سے انحراف، اسلامی تعلیمات سے بیگانگی اور قرآن وسنت کے فہم سے عاری پن نے اسلامی زندگی کو ہمارے لیے اجنبی اور غیر بنا دیا ہے۔ کسی تعلیم، کسی اخلاقی قدر، کسی قرآنی تقاضے اور حکم سے عملی واسطہ پڑتا ہے تو تعجب ہی نہیں، خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسلام سے ہم آہنگی اور اپنائیت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسے اختیار کرتے اور عملی زندگی کے تقاضوں کو اس کی روشنی میں پورا کرتے ہوئے جھجک ہی نہیں، شرم وندامت سی محسوس ہوتی ہے۔ مفاد خطرے میں پڑتے نظر آتے ہیں؛ ترقی کی راہیں مسدود دکھائی دیتی ہیں معاشرے میں نکو بن جانے کا خدشہ لاحق ہوجاتا ہے۔ معاملات و تعلقات میں دقتیں دکھائی دیتی ہیں۔ رشتوں ناطوں کے امکانات گم ہونے کا ڈر دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اونچے طبقے میں جگہ نہ ملنے کا دھڑکا سا لگ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلے پہل دعوتِ حق اپنے قریبی ماحول میں سانس لینے والے افراد کے سامنے رکھی اور اسلام کے اصول و احکام سنانا شروع کیے ——— تو ایسی ہی فضا تھی۔ لوگ اس دعوت کو عجوبہ سمجھتے اور اس کے اصولوں کو عجیب تصور کرتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ اس طرح کی باتیں بروئے عمل آتی ہیں اور وہ بدکتے تھے کہ اس طرح کی تعلیمات کے تابع ہو کر جینا ہے۔ اس فضا اور ماحول کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حقیقت ترجمان سے صادر ہونے والے ان الفاظ میں اشارہ موجود ہے جو مسلم اور ترمذی کی حدیث میں آئے ہیں: بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا - یعنی آغاز میں اسلام لوگوں کے لیے بالکل اجنبی دین اور اچنبے کی چیز تھی۔ لوگ

اس فضائے اجنبیت میں حیرت زدہ ہو کر پوچھتے تھے کہ اس دین کے احکام اور اس کی تعلیمات پر عمل بھی ہو سکتا ہے! — اور آج دین کو پھر وہی مرحلہ درپیش ہے۔ یہ لوگوں کے لیے بے گانہ اور اجنبی بن کر رہ گیا ہے کہ وہ صورت سامنے ہے کہ جس کو ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے۔ گویا وہ مرحلہ آگیا ہے جس کی خبر مذکورہ بالا حدیث کے دوسرے جملے میں دی گئی ہے وَسَيَعُودُ غَرِيبًا کہ پھر یہ لوگوں میں حیرت خیز اور بالکل ان ہونی اور انوکھی چیز متصور ہوگا۔

دین کی از سرِ نو غربت کا سبب صدیوں سے یہ دین، اپنی تمام تر سچائی اور راستی و عظمت کے باوجود، عملی زندگی سے خارج ہے۔ ایک نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات کے طور پر اسے پہچاننے میں اسی لیے دقت محسوس کر رہے ہیں کہ ہم اس کے مطابق زندگیاں گذارنے کے عادی بنے ہی نہیں اور اسے ضابطہ و دستور مان کر نہ چلے، نہ کسی کو چلتا دیکھا۔ ہمارے معاملات، اخلاق اور اجتماعی معاملات اس دینِ حق کی تعلیمات سے متصادم چلے آرہے ہیں۔ ہماری معیشت، سیاست، حکومت، قانون سازی، تجارت، تعلیم اور دوستی و دشمنی اور صلح و جنگ سب اسلام سے ناآشنا اور اس کے اثر سے بالکل آزاد ہیں۔ یہ اجتماعی نظام اور رہنمائے حیات ہونے کی حیثیت سے بلکہ نرے فلسفے کے طور پر ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس سے عقیدت رکھ لینا ہی دین داری قرار پایا۔ اس بے گانگی اور اجنبیت کا ایک دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عقیدت کے باریک اور کمزور دھاگے کو سلامت رکھنا بھی ترقی و تعمیر کے منافی محسوس ہونے لگا۔ اس دھاگے کو توڑنا روشن خیالی، ترقی پسندی اور مہذب ہونے کی علامت خیال کیا جانے لگا۔

جن کے ہاں یہ دھاگہ ٹوٹنے سے بچا انہوں نے بھی اسے ساری زندگی اور زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہونے والے دین کے طور پر اپنانے کے بجائے اس کے بعض فرعی اور جزئی چیزوں کو اصل اور کُل گمان کر کے انہی پر اپنی دینداری کی عمارت تعمیر کی۔ یہ عمارت صحیح اور مکمل اسلام کی آئینہ دار ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس عمارت کے اجزائے تعمیر میں آیت کریمہ کا ختم، میلاد کی محفلیں، شب برات کے کھانے، مرنے والوں کے ایصالِ ثواب

کے لیے شریعت کے منافی رہیں، رمضان کے روزے سے زیادہ عیدالفطر اور حج سے زیادہ عیدالاضحیٰ کے کھانوں، دعوتوں، لباسوں، سجاوٹوں اور رونقوں اور میلوں کو دین سمجھ لیا گیا۔

نظام اور رہنمائے حیات کے طور پر دین کو جب اختیار نہ کیا گیا، اسے تہذیبی سرچشمہ اور تمدنی معیار نہ مانا گیا تو ایک اعتقادی، تہذیبی اور روحانی خلا پیدا ہو گیا۔ جس طرح یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب کسی مقام کی ہوا شدت گرمی سے ہلکی ہو کر اُوپر اُٹھتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والے خلا کو باہر سے آندھی اور طوفان بن کر تیز ہوا پُر کرتی ہے بالکل اسی طرح ہمارے معاشرے میں دین کے ہمہ جہتی رول کو روک کر جو خلا پیدا کیا گیا تھا اُسے قریب کے ہندوانہ رسم و رواج اور فرنگی تہذیب کے طوفان نے پُر کر دیا۔ تہذیبِ جدید اور نظامِ سرمایہ داری کے اقدار و روایات نے بہت کم عرصے میں ہمارے ذہنوں کو مسحور کر لیا اور ہمارے دلوں پر قبضہ جما لیا۔

تہذیبِ مغرب کا مزاج

اس تہذیب و نظام کا خمیر ظاہرداری، چمک دمک، شان و شوکت، لذت پرستی، تن آسانی، آسائشات طلبی اور تعیش و بندگیِ تن سے اُٹھا ہے۔ راحت و آسائش کا حصول اور جن جن حصوں کو استلذاذ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اُن سے لذت یاب ہونے کی اس تہذیب نے کھلی چھٹی دے دی۔ فطری پابندیاں، ضبطِ نفس، شائستگی اور وقار، حلال و حرام کا تصوّر، جائز و ناجائز کا احساس، سب کو اس تہذیب کا سیلِ بے پناہ بہا کر لے گیا۔ خدائے حقیقی کی بندگی چھوڑ کر عیش کوشی اور لذات طلبی کا فلسفہ خدا بن گیا۔ اسی کی پوجا ہونے لگی۔ انسانی زندگی کا ہر سانس اسی مصنوعی خدا کی پرستش کے لیے صرف ہونے لگا۔ اس سے لازمی طور پر کچھ اخلاقی عوارض نے جنم لیا۔ خودغرضی، نفس پرستی، حرص و ہوس اور سچے خدا کو فراموش کرنا اس مادی تہذیب کا اصل الاصول ٹھہرایا گیا۔ اس تہذیب کے اس پہلے سبق کو ہمارے ہاں کے "ہونہار اور قابل" لوگوں نے اچھی طرح سے رٹ لیا۔ اور پیرویِ یہود و نصاریٰ اور تقلیدِ ہنود میں لگ گئے۔ ایثار و قربانی، مروت و ہمدردی، عطا و نوازش، مساوات اور احترامِ آدمیت

کے اسلامی تصور کو پسِ پُشت ڈال کر ہر کوئی اِس مادی دوڑ اور مقابلے میں شامل ہوگیا اور سب کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے نکل جانے کی دُھن سوار ہوگئی۔

اِسلام کا مزاج اِن منفی اور پست رویوں کے مقابلے میں اسلام نے تعلیم دی ہے کہ محروموں کو نوازو، پڑوسیوں کا خیال رکھو، یتیموں کی سرپرستی کرو۔ بے کسوں کا سہارا بنو، گرے ہوؤں کو تھامو، پریشان حالوں کا دُکھ درد بٹاؤ، مصیبت زدوں کے کام آؤ، غلاموں اور ملازموں کے حقوق کا خیال رکھو، جو خود کھاؤ وہی انھیں کھلاؤ اور جیسا خود پہنو ویسا ہی اُن کو پہناؤ، حق دار کی حق رسی کرو، عدل و انصاف کی میزان کو گرنے نہ دو۔ عیش و عشرت کے دلدادہ نہ بنو، سادگی اور قناعت کی روش اپناؤ، کھانے کے لیے نہ جیو، جینے کے لیے کھاؤ اور بلند مقصد کی خاطر جیو۔ اپنے مَن اور تن کی پرستش میں نہ لگے رہو۔ ربِ کائنات کی عبادت و اطاعت کو اپنا شعار بناؤ۔ نفس کے بندے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے نہ بنو۔ اِسی دُنیا کو اپنی منزل نہ سمجھو، سامانِ دُنیا پر ریجھ نہ جاؤ۔ اپنی کوششوں اور کاوشوں کو اسبابِ دُنیا میں صرف نہ کرو۔ چند روزہ راحت اور عارضی و فانی لذتوں کی خاطر دائمی اور ہمیشہ ہمیشہ کے اُس عیش کو نہ بھولو جو جنت میں تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ اِس عارضی اور ناپایدار دُنیا کے حصول کے لیے آپس میں مقابلہ نہ کرو، بلکہ حق، سچائی، نیکی، اطاعت اور بندگی اور دینی علم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ دُنیاوی اسباب اور مال و دولت میں اپنے سے بڑھے ہوئے لوگوں پر رشک و حسد کی نگاہ نہ ڈالو، بلکہ ان کو قابلِ رشک سمجھو جو اسلام کے لیے سب کچھ قربان کر کے حق کا بول بالا اور اسلامی نظام کو غالب کرنے کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور اللہ کی جنتوں کے حق دار بن رہے ہیں۔

یہ وعظ و تلقین اور اُصول و تعلیمات مغرب زدہ ذہنوں اور تہذیبِ جدید پر فریفتہ ہو جانے والوں کو عجیب اور ناگوار لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ دینِ اسلام سے اپنا رشتہ مردم شماری کے رجسٹر کے سوا کسی اور رُخ سے نہیں رکھتے۔ اِن سطور میں اِس طبقے کا ذکر ضرور آیا ہے لیکن صرف اس کے مزاج کی عکاسی کے لیے۔ یہاں ہماری اصل بحث ایک ایسے طبقے

سے ہے جو عجیب مخمصے اور شدید الجھن میں مبتلا ہے۔ جس کی پریشانی یہ ہے کہ پرواز دل و فکر کبھی رخِ تہذیبِ نو کی طرف لپکتا ہے اور کبھی شمعِ اسلام کے گرد منڈلاتا ہے۔ نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن والا معاملہ آ پڑا ہے۔ دین اور دنیا پرستی کے درمیان معلق کھڑا ہے۔ دین کو پورے کا پورا ہاتھ سے چھوڑنے پہ آمادہ ہے نہ دنیا کی لذتوں اور شیرینیوں سے دست بردار ہونا گوارا ہے۔ تھوڑا بہت دین بخشش کے من گھڑت تصور کے تحت گرہ میں باندھنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اور دین کی روح سے سراسر ٹکرانے والے مادی اصولوں کو بھی گلے سے لگائے رکھنے کا متمنی ہے۔ بیچ کے گروہ کا ہمیشہ سے یہی مسئلہ اور مشکل ہے۔ خدا کے ملنے کی توقع، ارادے کی کمی، عزم کی کمزوری اور نفس کی منہ زوری اور منافقت کے باعث نہیں ہے۔ اور وصال صنم اس لیے ممکن نہیں ہے کہ صنمِ دنیا کو اپنی پرستش میں دوئی و شراکت اسی طرح قبول نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی بندگی میں کوئی شریک منظور نہیں۔ اس طبقے کے لوگ اندیشے کا شکار ہیں کہ سارا دین ہاتھ سے گیا تو جہنمی ثابت ہوں گے اور دورِ نو کی لذتوں اور مسرتوں اور سامانِ عیش کو ترک کیا اور سادگی اور دیندارانہ رنگِ عبادت اپنے اوپر چڑھا لیا تو زندگی پھیکی اور بے کیف ہو جائے گی۔ اسلام سے تھوڑا سا تعلق اور اس کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ مطلوب ہے۔ لیکن اس پہ عمل کرنے اور اس کے مطابق زندگی گذارنے کے خیال ہی سے ہزار وسوسے اور اندیشے ستانے لگتے ہیں۔ ان اندیشوں کا اظہار کبھی زبانی اور کبھی عملی طور پہ ہوتا رہتا ہے۔

(باقی)

امام ابن حبانؒ

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

امام ابن حبانؒ (م ۳۵۴ھ) کا شمار ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔ حدیث میں ان کو غیر معمولی امتیاز اور کمال حاصل تھا۔ مؤرخین اور ارباب سیر نے ان کو حدیث اور متعلقاتِ حدیث میں وسیع نظر رکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ حدیث میں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں۔ امام ابن حبانؒ نے علومِ حدیث میں جو حیرت انگیز خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کا اعتراف تمام ائمہ فن نے کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے میزان الاعتدال میں امام ابوعبداللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"حدیث میں ان کی کتابیں یادگار ہیں"[1]

امام ابن حبان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ علمائے فن نے ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا اعتراف کیا ہے اور ان کی ثقاہت پر ائمہ فن کا اعتراف ہے۔

علامہ ابن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں کہ

"امام ابن حبان حافظ، ثابت اور امام حجت تھے"[2]

حدیث کے علاوہ فقہ میں بھی امام ابن حبان کو غیر معمولی درک حاصل تھا۔ فقہ میں آپ

---

[1] حافظ ابن حجر، میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۳۹۔

[2] ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب جلد ۳ ص ۱۶۔

نے امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) سے استفادہ کیا تھا۔ اور علمائے فن نے فقہ میں ان کے کمال و امتیاز کا اعتراف کیا ہے۔

حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو عبداللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"ابن حبان علمِ فقہ کا خزانہ تھے۔"[1]

علامہ سبکی (م ۷۷۱ھ) نے طبقات الشافعیہ الکبریٰ میں امام حاکم کا یہی قول نقل کیا ہے۔[2] دوسرے دینی علوم یعنی لغت، عربیت، صرف و نحو، ادب، تاریخ، فلسفہ و کلام، طب و نجوم اور جغرافیہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں۔

سوائے علم حدیث و علوم دیگر ہم داشت فقہ و لغت طب و نجوم، فلک و ہندسہ را نیک میدانست[3]

وہ علمِ حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی درک رکھتے تھے۔ فقہ، لغت، طب و نجوم فلکیات اور ہندسہ سے بھی خوب واقف تھے۔

ان گوناگوں علوم سے واقفیت و معرفت امام ابن حبان کی جامعیت کا ثبوت ہے۔ اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ علمائے اسلام میں ایسے جامع کمالات لوگ کم گزرے ہیں۔ جن کو اتنے علوم میں اس قدر رسوخ اور مکمل مہارت حاصل رہی ہو۔ ان میں کمالات اور جامعیت کی وجہ سے اربابِ سیر نے انہیں امام عصر اور العالم البحر کے القاب سے یاد کیا ہے[4] علم و فضل میں کمالِ امتیاز کی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم و فراست اور عقل و دانش

---

1. ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۹۔
2. تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ جلد ۳ ص ۱۴۷۔
3. شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۴۰۔
4. ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۴، ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۴۔

سے بھی نوازا تھا۔

امام ابو عبداللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) اور علامہ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے ان کی فہم فراست کا اعتراف کیا ہے۔ اور ان کو عقلاء رجال میں بتایا ہے[1]

امام ابن حبان کے علم و فضل اور جامعیت میں کمال کی بنا پر ان کی شہرت چار دانگِ عالم میں ہو گئی۔ ان کی مقبولیت و شہرت کا یہ حال تھا کہ جب آپ سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن تشریف لائے تو ان کے گھر پر شائقین علم اور طالبینِ فیض کا اژدہام رہتا تھا[2]

امام ابن حبان کے فقہی مسلک کے بارے میں اربابِ سیر نے سکوت اختیار کیا ہے تاہم بعض علمائے کرام نے اس کو شافعی المذہب لکھا ہے اور بعض علمائے کرام نے لکھا ہے کہ ابن حبان کسی خاص مسلک سے وابستہ نہ تھے۔ بلکہ اپنے استاد ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) کی طرح تقلید کے بجائے تفقہ و اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے ان کو مجتہدین میں شامل کیا ہے[3]۔ امام ابن حبان زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے۔ اور اس کے ساتھ بہت فیاض اور سخی بھی تھے۔ دُور دراز کے جو لوگ ان سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے، ان کے طعام اور مصارف خود ہی برداشت کرتے تھے[4]

ابن حبان پر بدعقیدگی کا الزام اور اس کا جواب

امام ابن حبان پر بدعقیدگی کا الزام عاید کیا گیا۔ علمائے کرام اور ائمہ فن نے اس الزام کی اصل حقیقت واضح کی ہے پہلے الزام ملاحظہ فرمایئے اور اس کے بعد ائمہ فن نے جو اس کا جواب دیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں،

حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی

---

[1] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۴

[2] ایضاً جلد ۳ ص ۱۳۴

[3] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۵۹

[4] ابن حجر، لسان المیزان جلد ص ۱۱۴

دم ۳۵۲ھ) ہے۔ میزان الاعتدال اور لسان المیزان میں اس اعتراض کو نقل کیا ہے کہ:

"ابو اسمٰعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں نے عبدالصمد سے اور انہوں نے اپنے والد محمد سے سُنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کی وجہ سے ان پر نکیر کی ہے۔ الحاد و زندقہ کا الزام لگایا۔ اور ان سے قطعِ تعلق کر کے خلیفہ سے ان کی شکایت کی۔ خلیفہ نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ ابو اسمٰعیل کہتے ہیں۔ مگر میں نے [illegible] وہ دوسرے شخص سے یہ سُنا کہ اس کی وجہ سے وہ جلا وطن کر کے سمرقند بھیج دیئے گئے تھے"[1]

اس اعتراض کے جواب میں علامہ ذہبی دم ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

"جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (الحج عرفۃ) یعنی حج عرفہ ہے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے صرف عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے۔ اور نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان و مناسک ادا ہو جائیں گے بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب سے اہم ضروری اور مقدم رُکن کو بیان کرنا ہے۔ اسی طرح ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل، یعنی نبوت علم و عمل کا نام ہے) کا منشا یہ ہے کہ نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و امتیاز ہے اور کوئی شخص ان میں درجۂ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبتِ الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے، جس کے لیے اللہ اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے۔ اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ ریاضت اور محنت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے مذکورہ بالا قول سے کوئی خرابی اور قباحت

---

[1] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۲۵، ابن حجر عسقلانی، میزان الاعتدال جلد ۳، ص ۳۹، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۳۔

نظر نہیں آئے گی۔ البتہ مطلق شکل میں ان سے جو منقول ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے وخیال کی ہے[1]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۲۵ھ) نے بھی اسی رائے وخیال کا اظہار کیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"تاہم کسی کے لیے اس طرح کی بات مطلقاً اور بلاقرینہ کہنا درست نہیں ہے۔ اگر ابن حبان کا مقصد صرف یعنی نبوت صرف علم وعمل ہی کا نام ہے تو بلاشبہ یہ زندقہ اور فلسفیانہ موشگافی ہوگا۔"[2]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) ابن حبان کے قول النبوۃ العلم والعمل کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان کا یہ قول (النبوۃ العلم والعمل) عقاید صحیحہ کے چنداں خلاف نہیں۔ کیونکہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے۔ جو علم وعمل کی ریاضت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے۔ بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ نبوت کے لیے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے۔ جو علم وعمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔[3]

"اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت ونبوت سے کس کو سرفراز کرے۔"

---

[1] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۵۔

[2] ابن حجر عسقلانی، میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۳۹، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۳، ۱۱۴۔

[3] الانعام ۔ ۱۲۴۔

رہا یہ عقیدہ کہ انبیاء علیہ السلام کو علمی و عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی - بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے - تو یہ بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے -

یا ابن حبان کا منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کو نبوت عطا کئے جانے کے بعد علم و عمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی ہے - اس لیے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں، تو یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے ''[1]

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول النبوۃ العلم والعمل میں بھی الزام و اعتراض اور الحاد و بدعقیدگی کی کوئی بات نہیں - زیادہ سے زیادہ زیادہ اس کو سوئے تعبیر کہا جا سکتا ہے

اور یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے محدث کبیر پر سوئے تعبیر کی کیا وجہ، اتنا بڑا الزام کیوں عاید کیا گیا - اس کا جواب بھی ائمۂ فن نے دیا ہے -

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے امام حاکم (م ۴۰۵ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''امام ابو حاتم (ابن حبان)، نہایت عالی مرتبہ تھے - اس بنا پر اس سے حسد کیا جاتا تھا''[2]

اور خوارج ابن حجر فرماتے ہیں:

''بجز عناد و تعصب کے ان پر اس الزام کے عاید کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی - وہ یگانہ روزگار اور غیر معمولی ذہین اور طباع تھے - ان کا حافظہ بے مثال تھا''[3]

---

[1] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۴۰

[2] ابن حجر، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۵ - [3] ایضاً ص ۱۱۴ -

تصنیفات | امام ابن حبان کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے، جنہوں نے بے شمار علمی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی تمام تصنیفات کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ امام حاکم (م ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے فنِ حدیث وغیرہ میں بیش قیمت اور عدیم المثال کتابیں لکھی تھیں[1]۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے تذکرۃ المحدثین میں ابن حبان کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے ان کی تعداد ۵۸ ہے[2] تاہم آپ کے لیے درج ذیل کتابوں کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

کتاب الہدایہ الی علم السنن | امام ابن حبان کی یہ کتاب حدیث و فقہ کی جامع کتاب ہے۔ اس میں ہر حدیث کی حکیمانہ اور فقہی تشریح کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ روایات کی کمی بیشی اور فرق و اختلاف کی صراحت کی گئی ہے[3]۔

کتاب الجرح والتعدیل | یہ کتاب دس جلدوں میں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے لسان المیزان کے مقدمہ میں اس پر نقد کیا ہے[4]۔

کتاب الثقات | یہ رجال کی مبسوط، اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے بعد فنِ رجال پر جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان سب میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے عجالہ نافعہ میں ابن حبان کی ایک عبارت اس کتاب سے متعلق نقل کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

> "اس میں صرف انہی ثقات کا ذکر ہے، جن کی روایتوں سے احتجاج جائز ہے۔ جن راویوں کی بعض لوگوں نے تضعیف کی ہے وہ بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ بشرطیکہ وہ میرے معیار کے مطابق ثقہ ہوں۔ میں نے

---

[1] ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۱۳۱۔

[2] ایضاً ص ۱۳۱۔

[3] معجم البلدان جلد ۲ ص ۷۰۔

[4] ابن حجر، لسان المیزان مقدمہ ص ۶۔

اپنے اصول اور معیار کو کتاب الفصل بین النقلہ میں تحریر کیا ہے۔ جو لوگ اس معیار و اصول کے مطابق ضعیف ہیں یا جن کی روایتوں سے استدلال روا نہیں ہے۔ میں نے ان کو اس میں شامل نہیں کیا ہے۔ ان لوگوں کا کتاب الضعفاء میں ذکر ہوگا۔[1]

صحیح ابن حبان | اس کا نام "التقاسیم والانواع" بھی ہے۔ یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتاب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) طبقاتِ کتبِ حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو شمار کیا ہے۔[2]

علامہ عبدالحی بن عماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"صحیح ابن حبان صحت کے لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے۔ بعض علمائے کرام نے اس کو صحیح ابن خزیمہ کے بعد رکھا ہے۔ اور بعض علمائے کرام نے سنن ابن ماجہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ صحیح ابن حبان کو قرار دیا ہے۔ اس کو محدث ابن حبان نے فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ امام صاحب نے ہر حدیث کے آخر میں رجال و اسناد کی تحقیق بھی کی ہے۔ حدیث کے مفہوم کی تعیین و وضاحت اور اسناد و فنون کی فنی بحثیں بھی کی ہیں، اور کئی دوسرے مفید معلومات بھی بیان کئے ہیں۔ کتاب کے عنوانات سے امام ابن حبان کی علم حدیث میں فقہی بصیرت اور عالمانہ ژرف نگاہی، اور سنت سے مکمل واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔[3]

صحیح ابن حبان کی اہمیت کے پیشِ نظر علمائے کرام نے اس کے حواشی و مختصرات ترتیب دیئے۔ علامہ ابوالحسن علی فارسی (م ۷۳۷ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر "الاحسان

---

[1] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فواید جامعہ بر عجالہ نافعہ (ص ۸)

[2] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۷۔

[3] ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب جلد ۳ ص ۱۶۔

فی تقریب صحیح ابن حبان کے نام سے مرتب کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے اس پر مفید حواشی لکھے۔ اور علامہ عمر بن المعروف بابن ملقن (م ۸۰۴ھ) نے اس کو مختصر ابواب پر مرتب کیا۔[1]

صحیح ابن حبان کو سب سے پہلے شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ نے ایڈٹ کر کے مطبعہ سلفیہ مدینہ منورہ سے شائع کیا۔ اور اب ۱۹۸۸ء میں مکتبہ الاثریہ سانگلہ ہل کے مالک و مدیر مولانا عبدالشکور صاحب اثری نے مطبع سلفیہ کا فوٹو سٹیٹ، جلدوں میں شائع کیا ہے۔

نام ونسب وخاندان ابن حبان، امام محمد، کنیت ابو حاتم اور لقب ابن حبان تھا۔ قصبہ بست کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ سیستان اور غزنی کے درمیان واقع ہے۔ بست کی خاک سے کئی نامور محدثین کرام پیدا ہوئے۔ سنن ابی داؤد کے شارح اور عظیم محدث صاحب معالم السنن امام ابو سلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔[2]

ولادت ابن حبان ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔[3]

اساتذہ ابن حبان کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) اور علامہ سبکی (م ۷۷۱ھ) فرماتے ہیں۔

> مصر سے خراسان تک کے بے شمار لوگوں سے ابن حبان نے اکتساب فیض کیا۔[4]

آپ کے اساتذہ میں امام ابوبکر بن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)، ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی

ع اس فقرہ کی تصحیح نہیں ہو سکی۔

[1] عبدالرحمٰن مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳۔

[2] معجم البلدان جلد ۲ ص ۱۸۰۔

[3] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۴۔

[4] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۴۔

(م ۳۰۳ھ) اور امام ابو یعلیٰ موصلی (م ۳۰۷ھ)، جیسے ائمہ فن اور نامور محدثین شامل ہیں۔ امام ابو بکر بن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) سے خاص تعلق تھا۔ فقہ، اصول، حدیث اور فرائض کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی[1] اور آپ کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ امام ابو عبد اللہ حاکم صاحب المستدرک (م ۴۰۵ھ) بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہیں[2]

رحلت و سفر امام ابن حبان نے علم و فن کی تحصیل کے لیے متعدد اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ ارباب سیر نے ان کے اسکندریہ (مصر)، نیشاپور، بغداد، کوفہ، محاصل، حلب، بخارا، حجاز اور شام وغیرہ جانے کی تصریح کی ہے[3]

وفات ابن حبان نے ۲۴ شوال ۳۵۴ھ بروز جمعہ ۸۰ سال کی عمر میں اپنے آبائی گاؤں بست میں انتقال کیا[4]

---

[1] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۳۴۔

[2] تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۱۴۱۔

[3] ابن حجر، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۱۵، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۴۔

[4] تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۱۴۱۔

رسائل ومسائل

زوجین کا ایک دوسرے کی میّت کو غُسل

سوال:- مجھے درج ذیل مسئلہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے۔ جواب سے مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ اللہ رب العزت مزید شرحِ صدر عطا فرمائے۔
بیوی کے فوت ہونے پر شوہر غُسل دے سکتا ہے خواہ دوسرے اعزّہ موجود ہوں۔
اس سلسلہ میں میں نے کسی صاحب سے دو روایتیں سُنی ہیں۔ اُن کی سند کے بارے میں بھی تصحیح فرمائیں مزید یہ کہ یہ واقعات احادیث کی کون سی کتاب میں مذکور ہیں۔ واقعات درج ذیل ہیں۔
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ ہائے افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس کس بات کا۔ اگر میری زندگی میں تمہاری موت کا وقت آتا تو میں خود تمہیں غسل دیتا۔
یہ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خود غسل دیا۔

جواب:- اس امر پہ فقہائے اُمت کا اتفاق ہے کہ بیوی اپنے خاوند کی میت کو غسل دے سکتی ہے۔ اس کے حق میں حضرت عائشہ رضؓ کا ایک قول کتب حدیث میں مروی ہے کہ "بعد میں جو کچھ سوچا، اگر پہلے خیال میں آتا تو آنحضورؐ کی ازواج مطہرات ہی آپ کو غسل دیتیں"۔ احناف کا استدلال اس مسلک کی تائید مزید میں یہ ہے کہ وفات کے بعد جب تک عدّت نہ گزر جائے، رشتۂ ازدواج کلیتہً منقطع نہیں ہوتا، لٰہذا بیوی شوہر کے جسد کو مَس کر سکتی ہے اور غسل دے سکتی ہے۔ لیکن خاوند کا اپنی اہلیہ کی میّت کو

چھونا اور غسل دینا، اس مسئلے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ فعل جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک رشتۂ ازدواج کی نوعیت میں فرق واقع ہو جاتا ہے اور زوجۂ متوفاۃ کی بہن سے زوجہ کے خاوند کا نکاح معاً جائز ہو جاتا ہے۔ مگر مذاہبِ ثلاثہ کی رُو سے خاوند بھی اپنی زوجہ کی میت کو غسل دے سکتا ہے۔ اس کے حق میں بھی احادیث مروی ہیں۔ مثلاً ابن ماجہ، الجنائز میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا:

لو مِتِّ قبلی فقمتُ علیکِ فغسلتکِ وکفنتکِ وصلّیتُ علیکِ ودفنتُکِ۔

(اگر تم مجھ سے پہلے وفات پاؤ تو میں تمہارے لیے سارے انتظامات کروں گا، تمہیں غسل دوں گا، کفن پہناؤں گا، نمازِ جنازہ پڑھوں گا اور تدفین کروں گا۔)

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بعض روایات میں آیا ہے کہ ان کی اہلیہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت کو غسل دیا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی میت کو غسل دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ سے متعلق روایات کی پوری تفصیل اگر آپ دیکھنا چاہیں تو نیل الاوطار، باب ما جاء فی غسل احد الزوجین الآخر میں ضروری معلومات آپ کو مل جائیں گی۔ بہرحال دونوں مسلکوں کے حق میں دلائل موجود ہیں۔ جو حنفی ہوں، انہیں چاہیے کہ وہ حنفی مسلک ہی کے مطابق عمل کریں۔ اس میں زیادہ احتیاط ہے اور کسی مسلک کی مخالفت نہیں۔ جو اہل حدیث ہیں، وہ دوسرے مسلک پر عمل کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی برابر دلائل پر مبنی ہے۔ (غلام علی)

مطبوعات

"اجتماعِ عام نمبر" کی اشاعت نے اتنا زیادہ وقت لے لیا کہ ہمارے پاس مطبوعات کے سلسلے کی کتابوں اور رسائل کا انبار لگ گیا ہے۔ اِدھر فوری طور پر دو روز پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ وسط اپریل میں یہ شمارہ تیار کرنا ہے۔ غنیمت کہ سابق کتابت شدہ مواد خاصا تھا، مطبوعات کے کچھ صفحے کتابت شدہ تھے۔ محبت کیش مصنفوں اور پبلشروں کو شکایت رہے گی۔ مجبوری ہے، لہٰذا درگذر فرمائیں (مرتب)

صحبتے با اہلِ حق | ضبط و ترتیب: مولانا عبدالقیوم حقانی۔ پیش لفظ مولانا سمیع الحق۔ ناشر: موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، پشاور۔ سفید کاغذ پر اچھی طباعت مطلا مضبوط جلد، صفحات: ۴۰۶۔ قیمت: ۷۵/- روپے۔ لاہور میں ملنے کا پتہ: مکتبۂ مدنیہ، ۱۷۔ اُردو بازار، لاہور۔

اقبال نے کہا تھا کہ: " از زمانِ خود پشیماں می شوم۔ در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم"۔ (میں اپنے زمانے کے حالات سے نادم و شرمسار ہو کر قرونِ رفتہ میں چھپ جاتا ہوں)، بالکل ایسی ہی کیفیت اپنی ہوتی ہے کہ جب مجھ پر ہنگامۂ زمانہ گراں ہو جاتا ہے تو میں رختِ سفر اُٹھا کر کسی اور دُنیا میں منتقل ہو جاتا ہوں۔ (یہ بھی ایک شعر اقبال کا ماحصل ہے)۔ ہمارے سینوں میں بھی اور سفینوں میں بھی بزرگانِ دین اور اسلافِ ذی علم و کردار کی ایک نورانی دنیا آباد ہے۔ ہم ماحول کی لغویات اور لوگوں کے رویوں کے ستائے ہوئے اسی دنیا میں جا پناہ لیتے ہیں۔

"صحبتے با اہلِ حق" کا نام ہی سامنے آیا تو یہ محسوس ہوا کہ یہ کتاب اسی نورانی دُنیا کی ایک جھلک ہے جو ۱۴ صدیوں میں طبق بر طبق آراستہ ہوئی ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی

ہماری ملاقات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق سے کراتے ہیں۔ جن کی شخصیت کے گرد اور بھی نجوم لمعانی دکھاتے ہیں۔ اور جن کے عالمانہ نکات اور روحانی اشارات ہمارے سامنے سوچ بچار اور عمل کی راہیں کھول دیتے ہیں۔ اس موقع پر اقبال کا یہ مصرعہ بھی یاد آیا:

ع صحبتِ روشن دلاں یک دم دو دم

ص ۲۷ پر بحوالہ ایک برطانوی خاتون مسز آرشیگ یہ مذکور ہے کہ روسی گرفت میں آئے ہوئے علاقوں میں ہزار مسلم کشی کے باوجود مسلمانوں اور روسیوں کے ہاں شرح پیدائش کا تناسب ۳:۱ ہے اور مسئلہ آبادی روسیوں کے لیے وجہ پریشانی بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس رفتار سے کچھ عرصے میں مسلمان اکثریت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی پریشانی انڈیا کو ہے اور عالمی طور پر یہی پریشانی اہل مغرب کو ہے کہ صیہونیوں کی طرح بڑھتی ہوئی غریب نسلیں ایک دن ان کی عیاشیوں اور مظالم کا حساب لینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ خاندانی منصوبہ بندی کے مسلم داعیوں کو یہ جاننا چاہیے کہ اس مسئلے کے کئی پہلو ہیں۔ ص ۲۸ پر ٹرک میں بھری ہوئی ہوا کے بوجھ اُٹھانے اور انسان پر ہوا کے دباؤ کے مسئلے میں قدرے مزید مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح فلکیات وغیرہ کے متعلق ہمارے دینی نظامِ تعلیم میں تجرباتی و مشاہداتی طریقوں پر تحقیقِ احوال ہونی چاہیے۔

بہتر ہوتا کہ حقانی صاحب ص ۴۰ پر درج روایت (اسرائیلی) کا حوالہ دے دیتے کہ اللہ پاک نے فرمایا: "اے موسیٰؑ! آپ کا لباس نبی کا لباس ہے"..... (اس لیے جادوگروں نے اسے پہن کر نبی کے ساتھ مقابلہ کیا) ..... "تو میری رحمت یہ گوارا نہ کر سکی کہ"... الخ۔ پھر علماء کے اتحاد کا ذکر ص ۴۷ پر آتا ہے۔ نفاذِ شریعت کے سلسلے میں جو افتراق کی آوازیں دینی رنگ میں اُٹھتی ہیں ان کا ازالہ کیسے ہو؟ کوئی حل؟

مجھے بہت مسرت ہوئی کہ اس کتاب میں اعلائے کلمۃ اللہ کی علمبرداری، نفاذِ شریعت، اقامتِ دین، دینی تحریک اور دینی انقلاب جیسی اصطلاحات ظاہر کرتی ہیں کہ دینِ حق کے وسیع تقاضے ملحوظ ہیں۔ اس کے ساتھ بہت قابلِ توجہ مولانا عبدالحق کا تعبدی ذوق، ان کی دینی تلقینات و تنقیحات، ان کا طریقِ عجز و انکسار، باطل اور طاغوتی طاقتوں کے لیے جلال بڑی ایمان افروز خوبیاں ہیں۔

تحفۃ الواعظین مصنف: علامہ ابو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ۔ مترجم: مولانا محمد ظہیر الدین

ناشر: قدیمی کتب خانہ، مقابل آرام باغ کراچی ۱۔ صفحات: ۴۲۴۔ قیمت: ۳۳/- روپے

اس کتاب کے مصنف علامہ ابن الجوزیؒ (متوفی ۵۹۷ھ) ہیں جو اپنے علم وفضل، تفقہ فی الدین، زہد وورع اور وسعتِ قلب ونگاہ کے اعتبار سے ائمہ سلف میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ قرآن وحدیث اور فقہ کے متعلق علوم وفنون اور اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں آپ کی تصانیف کی تعداد ڈھائی سو سے بھی متجاوز ہے۔ اور یہ ساری کتابیں اپنی جامعیت اور ثقاہت کے اعتبار سے اہلِ علم کے نزدیک مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اصل عربی کتاب کا نام "کتاب القصاص والمذکرین" ہے۔ اور مصنف کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے اندر جامعیت اور ثقاہت کے تمام پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہے۔ کتاب کے بارہ ابواب ہیں۔ جن میں وعظ کی اہمیت، مختصر تاریخ، ضروری شرائط وآداب اور تاریخِ اسلام کے ممتاز واعظین اور خطبات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان امور کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جن سے واعظ حضرات کو اجتناب کرنا چاہیے اور ساتھ ہی ان نام نہاد واعظین کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جن کا وعظ دعوت وتزکیہ کے بجائے فساد اور بگاڑ کا باعث ثابت ہوتا ہے۔

جہاں تک کتاب کے ترجمے کا تعلق ہے، اس میں سلاست اور روانی کے باوجود بعض مقامات پر ترجمے کا قدیم رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب وعظ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ (ا - د - ترابی)

اسلام اور کمیونزم مصنف: صابر نظامی۔ ناشر: ادارہ تفہیم الاسلام، قذافی مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۰۰ قیمت: ۲۵/- روپے

زیرِ نظر کتاب تصنیف سے زیادہ تالیف ہے کیونکہ اس میں دوسرے اہلِ قلم حضرات

کی تحریروں کے بہت سے اقتباسات شامل کتاب کیے گئے ہیں - ان میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر خورشید احمد، غلام احمد پرویز وغیرہم کی بعض کتابوں سے فوٹوسٹیٹ لے کر صفحوں کے صفحے لیے گئے ہیں - مگر اس تنوع میں ربط و ترتیب کا پہلو خاصا کمزور ہوگیا ہے۔ کتاب میں اسلام اور اشتراکیت کا تقابل کیا گیا ہے - مگر زیادہ تر معاشی پہلوؤں پر بحثیں ہیں - مگر بین السطور مصنف کا ذہنی جھکاؤ اشتراکیت کی طرف ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

بہر حال ۲۵ سے زائد کتابوں کے مصنّف صابر نظامی داد بلکہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ تن تنہا اتنا کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ (م - ر)

ماہنامہ تعلیمات مدیر مسئول : مہر محمد سعید اختر - معاونین : سید دلاور علی و چودھری علی حمد ؛ ناشر : انجمن فاضلین ، ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب -

ہم بڑی مسرت سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ خاص نمبر جسے "اقبال اور تعلیم" کا نام دیا گیا ہے ، فاضل مرتبین نے بہت محنت اور بہت قابلیت سے مرتب کیا ہے - ظاہری حسن، مضامین کا انتخاب اور حسنِ ترتیب، ہر چیز قابلِ ستائش ہے - بالخصوص باب تعلیم و تعلم میں حضرت علامہ کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں خاصے کی چیز ہیں - ان سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ فکرِ اقبال کا قصرِ عظیم حبِ اسلام اور حبِ مسلمین کی بنیادوں ہی پر تعمیر ہوا ہے - جو حضرات اس حقیقت کو جھٹلاتے ہیں یا تو خود دھوکے میں ہیں یا دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں -

اس نمبر کے حوالے سے یہ گذارش غالباً ناموزوں نہ ہو کہ اب اقبال شناسی کا دور ختم کر کے اقبال کے فکر کو عمل کی صورت دینے کے دور کا آغاز ہونا چاہیے - بالخصوص تعلیم کے میدان میں تو ان کے نظریات کو مشعل راہ بنانے کی بہت ضرورت ہے -

---

صحیفۂ انقلاب | وصیت از جناب امام خمینی ۔ ناشر: رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد ۔ صفحات: ۹۲ سفید کاغذ پر طباعت رنگین ٹائیٹل ۔ قیمت: درج نہیں ہے (غالباً مفت تقسیم کے لیے ہے)۔

زیر نظر کتابچہ حکومت ایران کی طرف سے سیاسی و مذہبی پروپیگنڈے کا ایک حصہ ہے جس کے ٹائیٹل پر جناب خمینی کی تصویر چسپاں ہے اور اسے پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) کی تعداد میں چھپوا کر ایرانی سفارت خانے نے اسلام آباد سے شائع کیا ہے ۔ اس میں موجودہ ایرانی انقلاب کے پس منظر، پیش منظر اور مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ اور دراصل یہ جناب خمینی صاحب کی ایرانی قوم کے نام اپنی وصیت درج ہے ۔ اصل وصیت نامہ فارسی میں ہے اور یہ اس کا ترجمہ ہے ، مگر افسوس کہ اس میں بعض دل آزار باتیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً:

۱ ۔ "میں جرأت کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ آج کی ایرانی قوم اور اس کی کروڑوں کی آبادی آج کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی حجازی ۔۔ اور امیرالمومنین (علی)، وحسین ابن علی (صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہما) کے دور کی کوفی و عراقی اقوام سے بہتر ہے"۔ (ص ۴۶) ۔ (گویا موجودہ ایرانی لوگ صحابہ کرامؓ سے افضل ہیں)۔

۲ ۔ نہج البلاغہ کو "قرآن کے بعد مادی و روحانی زندگی کا عظیم ترین دستور" لکھا گیا ہے ۔ (ص ۔ ۳۰)

۳ ۔ حدیث ثقلین کے بارے میں یہ غلط دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ "تمام مسلمانوں میں حدیث متواتر کی حیثیت رکھتی ہے"۔ (ص ۔ ۲۸)

۴ ۔ بنی اُمیہ پر علی الاطلاق (جس میں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں) لعنت بھیجی گئی ہے اور انہیں "بنی اُمیہ لعنۃ اللہ علیہم" لکھا ہے ۔ (ص ۔ ۳۴)

۵ ۔ "ہمیں فخر ہے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد خدا کے حکم پر رسول کریمؐ نے رکھی ہے اور امیرالمومنین علی ابن ابی طالب (ع) جیسا تمام قیود سے آزاد بندۂ خدا، انسانوں کو تمام زنجیروں اور غلامیوں سے رہائی دلانے پر مامور

ہے" (ص - ۳۰)

۶ ـ "آریائی اور عرب نسل، یورپی، امریکی اور روسی نسل سے کم نہیں ہے" (ص ۵۳)

۷ ـ "خدا کے عظیم حرم کے غاصب آلِ سعود بھی انہی ظالموں میں شامل ہیں ـ ان سب پر خدا کی لعنت، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولوں کی لعنت ہو" (ص - ۳۵)

۸ ـ "شاہ فہد ہر سال عوام کی بے پایاں دولت کا بہت سا حصہ قرآن کریم کی طباعت اور قرآن دشمن مذہب کے تبلیغی مراکز پر خرچ کرتا ہے۔ اور سرا پا بے بنیاد اور خرافاتی مسلک وہابیت کی ترویج کرتا ہے" (ص - ۲۹)

ہماری رائے میں یہ کتاب فرقہ وارانہ جذبات کو اُبھارنے اور مسلمانوں میں باہمی منافرت پھیلانے والی ہے - ایران پاکستان تعلقات سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی ایسی کوششیں تعلقات کو اور خراب کر دیں گی۔ (ا - د - ترابی)

بقیہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تعلیم کی زبوں حالی

جب پاکستان بن گیا تو نہ انگریز رہا، نہ ہندو رہا - اب حکمرانی کے تخت پر خود مسلمان متمکن تھا - سارے اندیشے اور خطرات دُور ہو چکے تھے - مغربی تعلیم کے ذریعے مغربی تہذیب بدستور ان میں نفوذ کر رہی تھی - مانع اب کوئی باقی نہیں رہا تھا - اس لیے جوق در جوق مسلمان مغربی تہذیب کے حوض میں نہانے لگے - بلکہ یہ فیشن بن گیا - اور مقابلہ ہونے لگا - ڈیڑھ صد سالہ دَورِ غلامی میں مسلمانوں نے اس قدر مغربی تہذیب اختیار نہیں کی - میلاے کے الفاظ میں اس قدر کالے انگریز پیدا نہیں کیے، جتنے پاکستان بن جانے کے بعد چالیس سال میں پیدا کیے ہیں - اب تو کیفیت یہ ہے کہ جیسے بند ٹوٹ گیا ہو اور سیلاب بہہ نکلا ہو جس میں سب بہے چلے جا رہے ہیں۔

خصوصی مطالعہ

اسلامی انقلاب

مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی

ڈاکٹر محمد امین صاحب مدینہ یونیورسٹی کے فضیلت یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب جدید کمپیوٹری سے طباعت اور سادہ رنگین ٹائیٹل کے ساتھ ۱۲۵ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ جس کی قیمت ۲۴/- روپے ہے۔ ایمان پرنٹرز نے شائع کی ہے۔ پتہ: ۵۹ ڈی، فیروز پور روڈ، لاہور۔

ہمارے نوجوان دوست ڈاکٹر محمد امین صاحب دلِ بے تاب اور خونِ گرم اور فکرِ شگفتہ سے آراستہ ہیں۔ انہوں نے شریعت کے نظامِ قانون کا مطالعہ کیا ہے اور اظہار رائے کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ جب وہ خالص علمی نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں تو مزاج میں تدبر اور اعتدال کا غلبہ رہتا ہے، جب وہ سیاسی ردِ عمل کی رَو میں ہوں تو انہیں بڑی آزمائش درپیش ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد امین اسلامی نظریۂ اجتماعیت، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے طریقِ کار اور حکمتِ دعوت و انقلاب کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی تحریر سے مستفید ہوئے۔ عرب سے پڑھ پڑھا کر آئے تو چند روز جماعت لاہور کے ساتھ مل کر کام کیا، مگر ان کے ... کی زوردار لہر انہیں ایک اور ہی مورد پہ لے گئی۔ خیر اس میں کیا ہرج، اسلامیت کے بھی اب کئی گھاٹ ہیں اور ہر شخص آزاد ہے کہ وہ گھاٹ گھاٹ سے سیراب ہو۔

تبصرے کا تو ... حق نہیں، ہم محض چند خیر خواہانہ مشورے دے سکتے ہیں۔

۱- فرمایا "ہمارے علماء بدقسمتی سے فقہی مسالک اور گروہ بندیوں میں منقسم ہیں" (ص ۱۳۲) مسالک اور گروہ بندیوں میں کمی کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم نوا ملی افتراق میں تازہ ترین اضافہ کر رہے ہیں۔ فرمایا "......راقم اور اس کے ہم خیال افراد نے الانصار المسلمون کے نام سے کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے" (ص ۱۳۴)

۲- بعض تضاد سامنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں "......اور اس نے (یعنی انصار المسلمون نے) دینی کام کرنے والے دوسرے عناصر سے اُلجھے بغیر اور کشمکش کیے بغیر صرف مثبت کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے" (ص ۱۳۵)
اب ملاحظہ ہو دوسرا رُخ: "اب تو صورت یہ ہے کہ وہ شکستیں کھا کھا کر نڈھال ہو چکے ہیں۔ اور آئندہ ایک دو انتخابات کے بعد بالکل نابود ہو جائیں گے......" "اور ایک وقت آئے گا کہ ان کی عزت و توقیر بالکل ختم ہو جائے گی...... اور اس طرح ان کی قیادتیں مجاوری کرنے اور فاتحہ خوانی کے لیے باقی رہ جائیں گی" (ص ۴۲) "وہ صرف اس قابل ہیں کہ اُن کی عقل کا ماتم کیا جائے۔ ان کے اخلاص پر نوحے لکھے جائیں اور مستقبل کا مورخ ان کا ذکر سفیہوں، دین فروشوں اور دین و ملت کے غداروں کے طور پر کرے" (ص ۴۷) یا اللہ! اس غیظ و غضب اور جلالت مآبی سے پناہ!
تو جناب یوں کرتے ہیں مثبت کام، دوسرے عناصر سے اُلجھے بغیر! مگر ڈاکٹر صاحب تو پہلے ہی اس جہاز سے جو ڈوبنے والا ہے چھلانگ لگا کر ایک ٹاپو پر پہنچ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے اب سر گھما کر پیچھے تو دیکھتے بھی نہیں۔

۳- کچھ آیات کے ماحاصل کے طور پر فرماتے ہیں کہ "ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ دین کو غالب و نافذ کر دینا اللہ کی مشیت تھی......" وہ اس لیے ہوا (اسلامی ریاست کا قیام یہ دورِ نبوتِ محمدیؐ) کہ یہ اللہ کی سکیم تھی" ــ اور اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ...... یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضورؐ کا مشن غلبہ و نفاذِ دین تھا"۔ (ص ۳۰)
"آج دعوت کے منہج کو اختیار کرتے ہوئے ہم سو فی صدی وہی نہج اختیار نہیں

کر سکتے جو حضورؐ کی ذات تک محدود تھا - وہ صرف آپؐ کے لیے منصوص تھا، ہمارے لیے منصوص نہیں ہے۔ (ص ۶۰) دلیل؟

ممکن ہے، حافظہ کوتاہی کرتا ہو، مگر قرآنی منشا کی ایسی تفسیر و تاویل نہ اسلاف میں سے کسی نے کی، نہ اخلاف میں سے۔ قضیہ یہاں یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مشیت اور شریعت کو اُلجھا دیا ہے۔ یہی اُلجھن تو اُن منکرین کی تھی جو کہتے تھے۔ لَوْ شَاءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا (الانعام - ۱۴۸) یعنی اگر اللہ نے ہمیں شرک سے روکنا چاہا ہوتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ اِسی طرح اِطعامِ اہل حاجت کی اپیل کے جواب میں دشمنانِ حق نے کہا تھا کہ " اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗ (یٰس - ۴۷) یعنی ہم ان لوگوں کو کیوں کھانا کھلائیں جنھیں اگر اللہ کو کھلانا پسند ہوتا تو وہ خود کھلا پلا دیتا۔ اسی طرح کی بات ایک اور پس منظر میں یہود نے کہی تھی۔ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ (المائدہ ۶۴) یعنی ہماری نکبت و بدحالی کا سبب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) خدا بخیل ہو گیا ہے۔ یعنی مصیبت تو مشیت کی وجہ سے ہے۔ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

پھر اس کا کیا علاج کریں گے آپ! کہ قرآن تو عین دعوت و تبلیغ، ہدایت و ضلالت، فتح و شکست ہر معاملے میں مشیت کی بالادستی کا ذکر کرتا ہے، مگر شریعت کے احکام اس دلیل سے معطل نہیں ہو جاتے کہ ہوگا تو وہی جو اللہ چاہے گا۔ ایک طرف اللہ کا تکوینی و تقدیری منشا ہے اور دوسری طرف دینی و شرعی حکم۔ ہم مکلف ہیں صرف دینی و شرعی احکام کے، ہمارا کوئی دخل تکوینی اور تقدیری دائرے میں نہیں ہے۔ مشیت اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، جو ہر دائرے میں اُس کے خود مقرر کردہ دستوروں کے مطابق کام کرتی رہتی ہے۔ شریعت کے مخاطب اور ذمہ دار (تا بحدِ امکان) ہم ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ یا اُلجھاؤ پیدا کر دیا جائے تو پھر نہ کسی تدبر سے قرآن سمجھ آسکتا ہے، نہ دین کے تقاضے، نہ دعوتِ حق اور اقامتِ نظامِ اسلامی کا مفہوم!

۴- متذکرہ طرزِ فکر نے مؤلف کو ایک اور عجیب و غریب نتیجے تک پہنچایا اور ایک نیا دعویٰ کر ایا ہے۔ فرمایا:

" پھر ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ حضورؐ کو اللہ نے جامعِ کمالات اور جامعِ صفات بنایا تھا، تاکہ اسلامی انقلاب اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا"...... " آج ہم میں کوئی حضورؐ جیسا نہیں ہے"...... " لہٰذا حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ سب کچھ کرنا جو حضورؐ نے کیا تھا، محض مثالیت اور خواب دیکھنے کی کوشش تو ہوسکتا ہے، اس کا عملی حقائق سے کوئی تعلق نہیں"...... " اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ذمہ اس طرح سے کام کرنا ہے ہی نہیں جس طرح کہ یہ حضورؐ کے ذمے تھا" (ص ۶۹)[1]

یعنی وہی بات جو دین کے متعلق سرسری باتیں کرنے والے لوگ کہا کرتے تھے کہ کہاں خدا کا پیارا رسولؐ اور جان و دل قربان کرنے والے صحابہؓ کرام، اور کہاں آج ہم جیسے لوگوں کا اسلامی نظام کی باتیں کرنا۔ وہ لوگ گذر گئے۔ اب قصہ ختم ہوا۔ نماز روزہ کرو، یہی بہت ہے۔

ایک کام یا فرض یا حق کو نبیؐ پاک کے لیے خاص کرنا ہو تو اس کی صریح دلیل ہونی چاہیے۔ کون سے کام ہیں جو نبیؐ کے لیے خاص تھے۔ اور کون سے کام ہیں جن کی ذمہ داری اُمت کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ محض حضورؐ کو جامعِ کمالات کہہ دینے سے تو آپ دین کے کسی تقاضے، کسی مظہر اور سنتِ رسولؐ یا طریقۂ حضورؐ پر خطِ تنسیخ و ترمیم نہیں کھینچ سکتے۔ ورنہ ہر شخص جس چیز کو چاہے آپ کی خود ساختہ دلیل سے مخصوص بہ حضورؐ قرار دے کر اُس سے چھٹی کر سکتا ہے۔ آخر قرآن میں جو اجتماعی قوانین، مالی، تعزیری،

---

[1] اتفاق سے انھی دنوں میں نے حسن مکی محمد احمد کی کتاب سوڈان میں عیسائیت کی یلغار کے متعلق پڑھی۔ اس دردناک اور عبرت انگیز کتاب میں اسلام کے متعلق مغربی اکابر (سیاسی و مذہبی) کے عجیب عجیب اقوال سامنے آئے۔ مشہور کرومر کہتا ہے کہ اسلام کا احیا ــــ یعنی وہ اسلام جو قرآن اور حدیث پر مبنی ہے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شاعرانہ نوعیت کا ایک خواب ہے۔ (متذکرہ کتاب ص ۳۸، ۳۹) کرومر اور امین صاحب کے ذہن کیسے گلے مل گئے ہیں۔

صلح و جنگ سے متعلق، حکومت و قضا کے بارے میں، دار الکفر اور دار الحرب سے تعلقات کے بارے میں نیز اقلیتوں کے حقوق وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔ کیا وہ صرف زیبِ داستان کے لیے مخصوص بہ دورِ نبوت ہیں؟ کیا وہ صرف نفل ہیں؟ آدمی کا کلام اور اس کا استدلال اگر ذرا بھی جھول رکھتا ہو تو وہ مشکلات میں گھر جاتا ہے۔ آخر بعد والوں کے لیے راہِ ہدایت و نجات "ما انا علیہ واصحابی" کو قرار دیا گیا ہے اور اس پر اجماعِ امت ہے۔ اسے آپ کس طرح گول کریں گے؟ اگر نبیؐ کا کام مشیت کا دکھایا ہوا معجزہ ہو تو وہ سنت نہیں ہوسکتا۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا ناقابلِ اطاعت اعجاز!

۵- پھر ایک نکتہ نزر کبیر نمبر ۴ سے بھی ہٹا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ارشاد یہ بھی ہے کہ "مسلم حکمرانوں اور حکومت کی اصلاح کی جدوجہد نہ ہر فردِ مسلم پر فرضِ عین ہے نہ واجب ہے اور نہ ہی ہر مسلمان کو اس کا مکلف ٹھیرایا جاسکتا ہے"۔ (ص ۴۰) یعنی پہلے اسے نبیؐ پاک سے مخصوص کیا، اب اسے نمازِ جنازہ کی طرح فرضِ کفایہ بنا دیا۔ علم شریعت میں خاص مدینہ شریف جاکر فضیلت حاصل کرنے اس دوست کو ہم کیا کہیں؟ وہ آگے کہتے ہیں: اگر کوئی عالم یا مصلح اس کے لیے کھڑا ہو جائے اور کچھ مسلمان جو اس کام سے ذہنی اور عملی مناسبت رکھتے ہوں اس سے تعاون کریں تو ساری امت کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ سبحان اللہ!

ذرا وہ آیت بھی سامنے رکھیے جس سے استدلال کیا گیا ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ...... الخ (التوبہ-۱۲۲)

یعنی یہاں ذکر ہے تفقہ فی الدین کا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو ضروری نہیں کہ ہر جگہ سے (سارے قبیلوں سے) اہلِ ایمان یک دم نکل کھڑے ہوں بلکہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے اور دین کو سمجھ کر (یا اس کا علم حاصل کر کے) اپنے لوگوں میں واپس جاتے اور ان میں تبلیغ و تخویف اور تعلیم کا کام کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ جہاد پہ کام کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے مگر مقصد یہ ہے کہ جہاد کی کوشش بھی تو علمِ دین یا تفقہ کے بل پہ پیدا ہوسکتی ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاد کے زمانے میں تفقہ کے لیے زیادہ آدمی وقت

نہیں دے سکتے، لہٰذا دو دو، چار چار افراد کو آنا چاہیے۔

۶۔ ڈاکٹر صاحب کی موجِ تفکر نے ایک بار پھر پلٹا کھایا ہے۔ فرماتے ہیں: "جہاں تک نشأۃِ ثانیہ، عالمی غلبۂ دین، شہادت علی الناس، اعلائے کلمۃ اللہ یا شہادتِ حق کا تعلق ہے (ہمارے نزدیک یہ مترادف اصطلاحات ہیں)"...... "اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اُمتِ مُسلمہ متحد ہو کر ایک اُمت بن جائے (خود بخود۔ ف۔ ص) اپنی طاقت کو مجتمع کرے (بغیر کسی سعی و منصوبہ کار کے۔ ف۔ ص) دین کی تعلیمات و احکام کو عملاً اپنے ہاں نافذ کرے" (حالانکہ اس سلسلہ میں کام نہ ڈاکٹر صاحب کرنے کو تیار ہیں، نہ کسی کو اجازت دیتے ہیں، بلکہ اُسے دورِ نبوت کے مشیت کا خاص پروگرام قرار دیتے ہیں۔ ف۔ ص) تا کہ ساری دُنیا بچشمِ سر اسلام اور اس کے عملی نتائج کو دیکھ لے، اس طرح جب اتمامِ حجت ہو جائے تو پھر صحابہ کرام رض کی طرح غیر مسلموں کو اسلام، جزیہ یا جنگ کا الٹی میٹم دے" (ص ۵۲) یعنی یہ عظیم الشان کام اپنے سارے تقاضوں سمیت کہیں کچھ لوگ کر ڈالیں، ہم اپنے غیر سیاسی غیر اجتماعی کار دعوت میں لگے رہیں گے۔ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔

اس کتاب میں ایک تفصیلی منشور بھی دے دیا گیا ہے، جس میں زیادہ تر یہ بتایا گیا ہے کہ حکومت کو کیا کیا کرنا چاہیے۔ بعض اچھی سفارشات ہیں، مگر سفارشات کو منشور نہیں کہتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بکھرے اور ٹکراتے خیالات و استدلال کی کڑیاں جوڑ کر کوئی نظامِ فکر بنا کر کام کی راہ کا شعور حاصل کرنا تو سوائے کچے ذہن کے کچھ لوگوں کے، کسی اعلیٰ سطح و معیار پر ممکن نہیں ہے۔ مغالطہ انگیزی کا سحر بہت عارضی ہوتا ہے۔ البتہ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مضطرب مزاج کو ایک تسکین بخش مورد مل گیا۔ کسی شخص کے لیے اپنی جگہ یہ بھی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی میکدے سے جرعۂ اطمینان پالے۔

البتہ اگر موصوف ایک نئی فکر، نیا استدلال اور نیا پروگرام لانے سے پہلے تھوڑا سا مطالعہ و تدبر اور کر لیتے تو اُن کے لیے اور ملتِ اسلامیہ کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی کہ کاتا اور لے دوڑی۔ سال دو سال میں گاڑی نکل تو نہ جاتی

بات ختم کرتے کرتے میں یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ چاہے غیر سیاسی اور غیر انتخابی دعوت کو اختیار کر لیں، مگر اسلام دشمن اور ملت دشمن قوتیں سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی بلکہ فکری تسلط حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ کوشاں ہیں۔ کمیونسٹ، سیکولرسٹ، قادیانی، صلیبی، صیہونی، بھارت پرست، افرنگ نواز، اسمٰعیلی وغیرہ گروہ اپنے اپنے طریقوں سے اسلام کے لیے اُبھرنے کے راستے بند کر کے خود اپنے افراد اور نظریوں کو ہر جگہ مسلط کر رہے ہیں۔ ذرا اس مصیبتِ عظمیٰ کا بھی مطالعہ فرمالیجیے ان قوتوں کے لیے میدان کو خالی چھوڑ کر، تمام مسلمان (خصوصاً ان کے اسلامی گروہوں اور کمیوں) کو کنارے نہیں ہو جانا چاہیے۔ بلکہ طاغوتی حملوں کا منہ پھیر دینے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کام میں کئی سال لگ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں مباحث تو اور بھی بہت سے ہیں۔ مگر ہم نہ ذوقِ مناظرہ رکھتے ہیں، نہ دینی حلقوں کی معرکہ آرائیوں کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہمارے پاس ان نیک کاموں کے لیے وقت اور رسالے کے وافر صفحات ہیں۔ خدا کرے کوئی بات ناگوار نہ ہو۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

فروری سنہ ۹۰ء

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

رُوداد اجتماعِ عام

- ○ افتتاحی خطاب
- ○ کلیدی خطاب
- ○ خطاب جلسہ عام
- ○ اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد
امیر جماعت اسلامی

اعلامیہ

رپورٹ جماعت اسلامی پاکستان
۸۳ء — ۸۹ء

اجتماعِ عام نمبر ۸۹ء

اشاعت فروری ۹۰ء

دیگر تقاریر:

- ○ درُوس قرآن وحدیث
- ○ ایمان اور دعوت وجہاد
- ○ رُحماءُ بینھُم
- ○ پاکستان میں جماعت کا کردار
- ○ خواتین کا کردار
- ○ نوجوانوں کا کردار
- ○ ہم کیا معاشی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں؟
- ○ بین الاقوامی مندوبین

ٹائیٹل دیدہ زیب

کتابت کمپیوٹرائزڈ

ضخامت غیر معمولی

قیمت:

مقررین

- مولانا جان محمد عباسی ○ پروفیسر غفور احمد
- چودھری رحمت الٰہی ○ پروفیسر خورشید احمد
- خرم مراد ○ مولانا گوہر رحمٰن
- مولانا فتح محمد ○ مولانا عبدالحق
- حافظ محمد ادریس ○ لیاقت بلوچ
- سید منور حسن

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ - اردو بازار لاہور
فون: ۳۲۴۴۶۸ — ۶۸۶۳۶ ○ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۳